تِلکَ الایّامُ نُداوِلُہا بینَ النّاس

لاہور

سِکھّوں کے عہد میں

از

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

۱۹۶۴ء

کتاب خانہ نورس

(کاپی بک شاپ) کبیر سٹریٹ کاپی بازار - لاہور،

ناشران = کتاب خانہ نورس (کاپی بک شاپ)
کبیر سٹریٹ کاپی بازار۔ لاہور،

طابع = ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی،

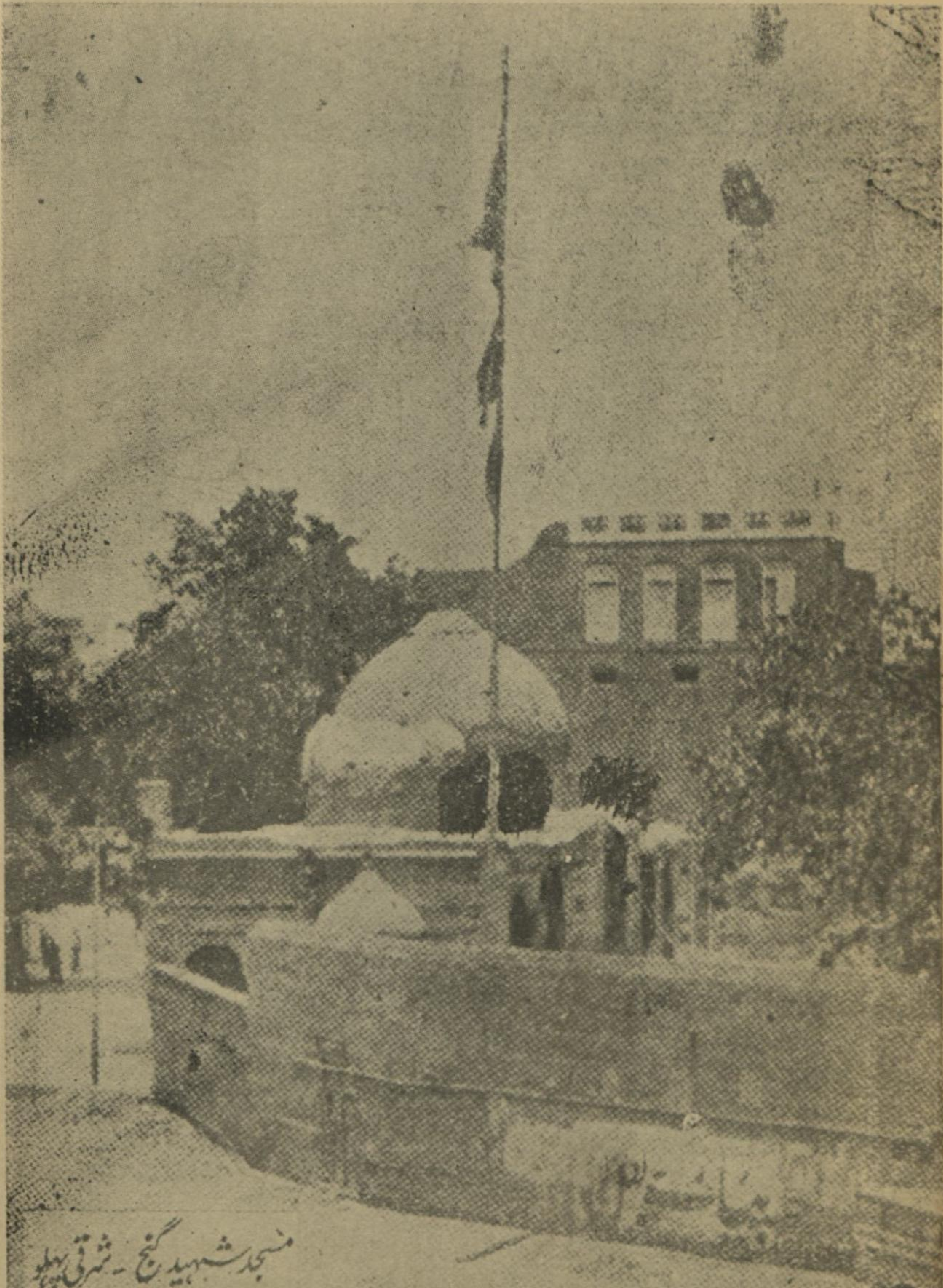
مطبوعہ = دین محمدی پریس لاہور

تعداد اشاعت = ۱۰۰۰

قیمت = 4.50 روپے

بار اوّل جولائی ۱۹۶۲ء

فہرست مضامین



مسجد شہید گنج - شرقی پہلو



مسجد شہید گنج - غربی و جنوبی پہلو

انتسابؔ

مسجد شہید گنج

کے

شہیدوں کے نام

مقدمہ

یہاں شائع کردہ مسودہ بعنوان "لاہور سکھوں کے عہد میں" اوائل
۱۹۵۴ء میں روزنامہ "امروز" لاہور میں بالاقساط زیرِ عنوان "لاہور کے
آثارِ قدیمہ سکھوں کے عہد میں" شائع ہوتا رہا جسے اب نئی ترتیب و ترمیم
کے بعد عنوان بالا سے پیش کیا جاتا ہے۔ جس کی تیاری میں حتی الامکان
مستند ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس مسودہ کا محرک دراصل میرا عقیدہ ہے یعنی کسی قوم کے آثار
ہی اس کی ثقافت و تاریخ کے آئینہ دار ہوتے ہیں چنانچہ لاہور
کے عہدِ اسلامی کے آثار ہمارے ماضی کا آئینہ و امانت ہیں۔
جبکہ مسلمانوں نے سلطان محمود غزنوی کی فتح ۴۱۲ھ سے لے کر ہندوستان
میں صدیاں متواتر حکومت کی اور لاہور کو ہمیشہ ایک عظیم الشان ثقافتی شہر
کی حیثیت حاصل رہی جبکہ یہاں ہر عہد میں وہ وہ بلند پایہ اور ہر نوع کی
عمارات بنتی رہی ہیں کہ جو کسی اور شہر کو کم نصیب ہوئی ہیں حتی کہ لاہور
اٹھارھویں صدی کے آخیر سے سکھ گردی کا شکار ہوا اور ۱۸۴۹ء سے برٹش
کا قبضہ ہو گیا اور ۱۹۴۷ء سے پھر پاکستان کا عظیم الشان شہر شمار ہوتا ہے
البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ لاہور کی نشاۃ ثانیہ اکبر کے عہد سے ہوئی
جبکہ اسے از سرِ نو پلین کیا گیا اور اس وقت کا قدیم لاہور آج بھی قائم

ہے - جسے ہم لاہور کی مجمل تاریخ عہد بعہد میں بیان کریں گے
افسوس اس امر کا ہے کہ لاہور کی کوئی مفصل تاریخ کسی عہد میں
بھی نہیں لکھی گئی مگر انیسویں صدی میں چند کتابیں لکھی گئیں جن
میں سے مندرجہ ذیل کتب بہت اہم ہیں۔

۱- تحقیقاتِ چشتی از نور احمد چشتی لاہور ۱۸۶۵ء

۲- تاریخ لاہور از رائے بہادر لالہ کنہیا لال - لاہور ۱۸۸۴ء

۳- تاریخ لاہور (انگریزی) از خان بہادر سید محمد لطیف -
لاہور ۱۸۹۲ء -

جن سے راقم نے اس مسودہ کی تیاری میں کما حقہ استفادہ
کیا ہے اگر یہ کتابیں بھی نہ ہوتیں تو ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا -
خاصکر سکھ عہد کے حالات میں جو زیادہ تر ۱۷۶۴ء سے لے کر
۱۸۴۹ء تک قریب ایک صدی پر مشتمل ہیں لاہور کا ماحول سوائے بدامنی
کے اور نظر نہیں آتا اور اس زمانہ میں جو لاہور میں شکست و ریخت ہوئی وہ
بذاتِ خود ایک المناک داستاں ہے سکھوں نے کوئی خود اپنا طرز
تعمیر نہ وضع کیا اور نہ کسی عمارت کو مابہ الامتیاز ان سے منسوب کیا
جا سکتا ہے - اس عہد کے واقعات کو میں نے اس غرض سے ایک
جا جمع کر دیا ہے - کہ آئندہ نسلوں کو معلوم ہو کہ ہمارے آثار
قدیمہ جو کسی نہ کسی طرح بچ گئے ہیں ان کی زبوں حالی زیادہ تر اس
عہد کا نتیجہ ہے اور وہ قوم جو خود اپنا کوئی ثقافتی طرۂ امتیاز نہیں

پیش کر سکتی وہ دوسروں کے آثاروں کو کس بے دردی سے پامال کرتی ہے۔

۱۸۴۹ء سے پنجاب پر برٹش کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے لاہور کی اس حالتِ زار کو اور اسلامی آثاروں کو لاوارث دیکھ کر جس طرح چاہا اپنی تعمیرات کا آغاز کیا اور اس ابتدائی جہاں گردی کے زمانہ میں بھی لاہور کی اکثر عمارتیں بطور کنیسہ استعمال ہوئیں یا عیسائیوں نے قبضہ کر لیں اور آج تک بھی بعض ان کے قبضہ میں ہیں مگر انگریز حکام نے جلدی اعلیٰ سرکاری عمارتیں بنائیں اور ہر مذہب و ملت کی عبادت گاہوں کو جلد واگذار کر دیا جس میں سے خاص کر بادشاہی مسجد قابل ذکر ہے جو ۱۸۵۶ء میں مسلمانوں کو قریب ایک صدی بعد واپس ملی اور انگریز نے ایک صدی بعد اس ملک کو ۱۹۴۷ء میں چھوڑا تو اپنا ایک خاص طرز تعمیر بھی چھوڑا یہی وجہ ہے کہ ان کی عمارات قبل عہد انگلشیہ کی عمارات سے بالکل مختلف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر قدیم عمارات بوجہ نگرانی محکمہ آثارِ قدیمہ بالکل تباہ ہونے سے محفوظ ہو گئیں۔

چونکہ قدیم آثار بمصداق ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　آثار پدید است صنادید عجم را

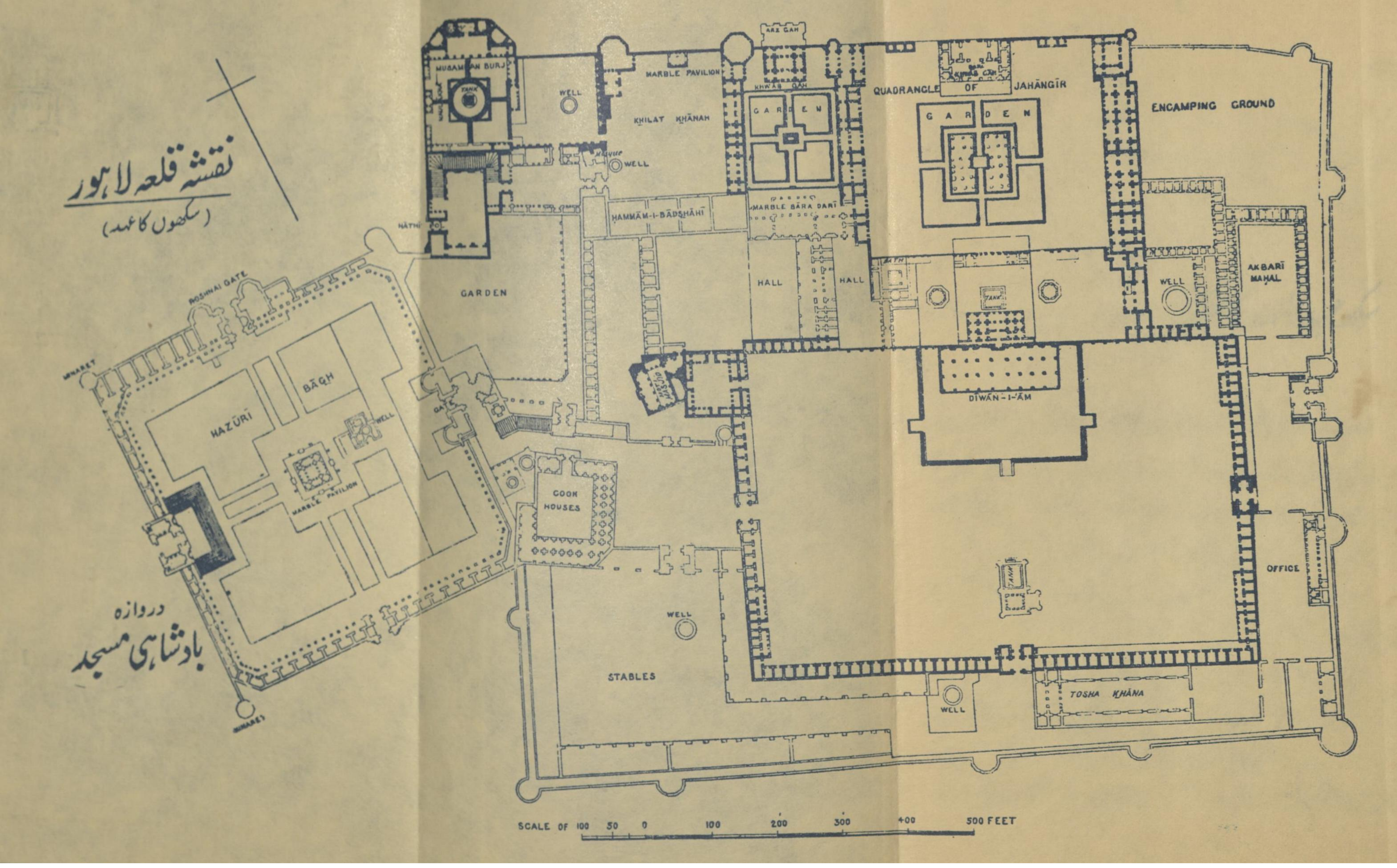
ہمیشہ ماضی کی یاد کو زندہ رکھتے ہیں۔ اپنے بنانے والوں کی عظمت اور اپنے عہد کی تہذیب و تمدن کا آئینہ پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو ضائع کرنے سے احتراز کرنا لازمی ہے البتہ ہمارا ایمان ہے کہ دنیا میں ایک دن بمصداق آیۃ کریمہ:-

کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ

"ہر چیز کو سوا اس ذات پاک کے فنا ہے"

وما توفیقی اِلّا باللہ۔

محمد عبداللہ چغتائی



نقشہ قلعہ لاہور
(سکھوں کا عہد)
دروازہ
بادشاہی مسجد
MUSAMMAN BURJ
MARBLE PAVILION
WELL
KHILAT KHĀNAH
WELL
ARZ GAH
KHWAB GAH
GARDEN
QUADRANGLE OF JAHĀNGĪR
GARDEN
ENCAMPING GROUND
HAMMĀM-I-BĀDSHĀHĪ
MARBLE BĀRA DARĪ
HALL
HALL
WELL
AKBARĪ MAHAL
GARDEN
ROSHNAI GATE
MINARET
BĀGH
HAZŪRĪ
WELL
GATE
MARBLE PAVILION
COOK HOUSES
DĪWĀN-I-ĀM
OFFICE
WELL
STABLES
TOSHA KHĀNA
WELL
MINARET
SCALE OF 100 50 0 100 200 300 400 500 FEET

سکھ عہد کا لاہور کا نقشہ

لاہور کے قلعہ میں محکمہ آثارِ قدیمہ کا ایک چھوٹا سا عجائب گھر بھی ہے۔ جب ہم اس کی چوکھٹ عبور کر کے اندر داخل ہونے لگتے ہیں تو ہماری نظر سب سے اوّل دائیں بازو پر لاہور کے قلعہ کے ایک قدیم نقشہ پر پڑتی ہے جس پر لکھا ہے "نقشہ قلعہ لاہور مع شاہی عماراتِ قلعہ جیسا کہ وہ سکھوں کے عہد میں تھیں۔"
ہم اسے یہاں بھی شائع کر رہے ہیں کیونکہ یہ کبھی پنجاب ہسٹاریکل جنرل میں ۱۹۱۲ء میں شائع ہو گیا تھا۔

اس عنوان نقشہ کو ذرا تامل اور توجہ سے دیکھئے تو قلعہ کی اندرونی عمارات کی کیفیت تو بہت گہری نظر اور مطالعہ کی محتاج معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم بادشاہی مسجد۔ حضوری باغ معہ بارہ دری اور سکھوں کی ان یادگاروں کو جو قلعہ سے ملحق ہیں دیکھتے ہیں اور آج کے نقشہ ماحول سے جب ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو

خاصا فرق ہی نہیں بلکہ نقشہ ہی بدلا ہوا نظر آتا ہے اور ہماری گہری دلچسپی اور شوق مطالعہ میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ہماری تحقیق فوراً سکھوں کے عہد حکومت کی ابتداء کا رخ اختیار کر لیتی ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ آج جو فرق نظر آتا ہے وہ کب سے ہے اور سکھوں کے عہد سے قبل اس کا کیا نقشہ ہو گا۔ چنانچہ ہم آج ایک بالکل مختلف ماحول میں کھڑے ہو کر اس عہد کا اس نقشہ کے لئے مطالعہ کرتے ہیں۔ اس وقت باغ میں آج کی طرح فوارے اور حوض نہیں تھے۔ بلکہ ان فواروں کے عوض ایک کنواں مع چھوٹا حوض وغیرہ کے مشرق کی طرف ضرور تھا جو اب نہیں ہے البتہ وہ حوض موجود ہے اس کنوئیں سے یہ تمام باغ اس وقت سیراب ہوتا تھا آج کی طرح باغ کے ارد گرد اعلیٰ سڑک بھی نہیں ہے اور نہ ہی حضوری باغ سے آگے چل کر سکھوں کا گوردوارہ اتنا وسیع چار دیواری کے اندر تھا بلکہ روشنائی دروازہ سے سیدھا ایک راستہ چل کر آگے شمال کی طرف ایک اور دروازہ جس کا نام گارڈن گیٹ تھا سمادھ رنجیت سنگھ کی عمارت کے ساتھ جاتا تھا اور حضوری باغ گیٹ سے جنوب کی جانب ہیرہ منڈی بادشاہی مسجد کے کنوئیں کے ساتھ ایک دیوار قلعہ کی دیوار کے ساتھ برابر لگتی تھی آج بالکل مفقود ہے۔ یہ امور آج ناظر کے لئے ضرور حیران کن ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان امور کو وضاحت سے سمجھنے کے لئے عہد سکھاں کی مختصر کیفیت ابتدا میں بیان کر دی جائے اور یہی زمانہ لاہور کی شکست رنجیت کا ہے۔ راقم اسی عہد کے مصنفین کی تحریروں سے استفادہ کر کے عوام کے سامنے ان آثار کے حالات کو مختصر طور پیش کرنا مناسب سمجھتا ہے۔

سکھوں کے عہد کی مختصر کیفیت

اس تمام عرصہ میں جو سکھوں کا زمانہ کہلاتا ہے۔ (یعنی ۱۷۶۵ء سے لے کر ۱۸۴۹ء تک) لاتعداد آفتیں اور صدمے جو لاہور پر گذرے اور ان سے لاہور کے قدیم آثاروں کو جو نقصان پہونچا اس کو یہاں کے مورخ لالہ کنھیا لال کی زبانی سنئے۔ ہم اس کی تحریر کو یہاں ۱۷۵۸ء سے درج کرتے ہیں جس زمانہ میں یہاں ادینہ بیگ گورنر پنجاب کا خاتمہ ہو چکا تھا اور لالہ کنہیا لال اس واقعہ کو لاہور پر بارہواں صدمہ قرار دے کر یوں لکھتا ہے (صفحہ ۳۲) اس زمانہ میں کہ بادشاہ ہندوستان میں مرہٹوں سے لڑ رہا تھا۔ سکھوں کی قوم نے پنجاب کے چاروں طرف ہنگامہ قتل و غارت گرم کر رکھا تھا۔ کیونکہ بادشاہی فوجدار سب کے سب اپنی اپنی فوج کے ساتھ بادشاہ کے ہم رکاب تھے۔ صوبہ لاہور کے پاس متعدد سوار اور تھوڑے سے پیادہ تھے۔ کسی مفسد کو قرار واقعی سزا نہیں مل سکتی تھی۔ ایسے غنیمت وقت اور نا پُرسان حالت میں سرداران سکھ یعنی جسا سنگھ آلو والیہ، جیت سنگھ کنہیا، گوجر سنگھ بھنگی، لہنا سنگھ وغیرہ نے باہم متفق ہو کر بمقام امرتسر تجویز کر کے ارادہ کیا کہ لاہور کو لوٹ لیں چنانچہ دس ہزار سکھ کی جمعیت کے ساتھ یہ سردار لاہور پر چڑھ آئے جب متصل پہنچے ان کے خوف سے کریم داد خان ناظم نے شہر کے اندرونی حصار کے دروازے بند کر لئے۔ باہر کی آبادیوں پر سکھ آپڑے اور غارت شروع کی سب محلے لُٹ کر برباد ہو گئے۔ رعایا بے چاری آفت کی ماری ایسی لٹی کہ بدن کے کپڑوں تک کو سکھوں نے نہ چھوڑا۔ بہت سی اشراف سردار عورتیں کھڈوں میں گر گر کر مر گئیں۔ مرد بے چارے

بہت سے مارے گئے اور بہت سے ملکوں کو بھاگ گئے۔ کچھ حصار کے اندر جا رہے جب سامان منقولہ لٹ چکا تو حویلیوں پر آفت آئی چھتوں کی لکڑیاں دروازوں کے کواڑ جو اچھے دیکھے جاتے مکانات میں سے اتار لئے جاتے باقی مکان کو آگ لگا دی جاتی۔ کئی روز تک یہ نازنین شہر جلتا رہا۔ غرضیکہ باہر کی سب آبادیاں جب جل کر خاکستر ہو گئیں تو دشمن نے اندرونی شہر کی طرف توجہ کی اور نہایت زور ڈال کر چاہا کہ اندر شہر میں گھُس جائیں اور اندرونی شہر کو لوٹیں۔ کریم داد خان نے بحالت ناچاری سکھوں کے پاس صلح کا پیغام بھیجا (صفحہ ۲۳) سکھوں نے جواب دیا کہ اگر کریم داد خان پچاس ہزار روپے نقد خالصہ جی کو کڑاہ پرشاد کے واسطے دے دیوے تو خالصہ جی نذرانہ لے کر چلا جائے گا چنانچہ بعد جواب وسوال تیس ہزار روپیہ مقرر ہوئے اور سکھ تیس ہزار روپیہ نقد لے کر واپس چلے گئے۔ دو ماہ کے بعد جب احمد شاہ مرہٹوں پر کامل فتح پا کر لاہور کی ایسی حالت دیکھ کر مارے غضب کے آگ بگولا ہو گیا اور سکھوں کی گرفتاری کو چاروں طرف فوج بھیجی مگر کوئی نظر نہ آیا سب جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔"

احمد شاہ ابدالی کا پانچواں حملہ ۱۷۶۱ء میں ہوا جس کا نتیجہ پانی پت کی مشہور جنگ ہے جس میں مرہٹوں کو نانا فرنویس کے تحت شکست فاش ہوئی۔ مرہٹوں کا خاتمہ ہو گیا اور لاہور میں اس وقت سکھوں کی حکومت بدستور ترقی پر رہی۔ خواجہ عبید خان کو لاہور کا گورنر مقرر کیا مگر احمد شاہ ابدالی پھر ۱۷۶۲ء میں واپس کابل سے آیا اور سکھوں اور افغانوں کے درمیان ستلج کے کنارے جنگ ہوئی جس میں سکھوں کو شکست فاش ہوئی جسے سکھ گلوگھارا کہتے ہیں اور ابدالی اپنے بعد لاہور کا گورنر ایک کھتری کابلی مل کو چھوڑ گیا مگر سکھ پھر آدھمکے اور ابدالی کو پھر ان کی سرکوبی کے لئے ساتویں بار آنا پڑا اور

اسے ناکام واپس جانا پڑا۔ کابلی مل کو نکال کر خود قابض ہو گئے اور لاہور میں سکھ حاکموں کے تحت ۱۷۶۴ء سے آگیا۔ کنہیالال اس واقعہ کو تیرھویں صدمہ کے عنوان سے یوں بیان کرتا ہے:۔

"خواجہ عبید خان کی تقرری کے بعد جب بادشاہ کابل کو گیا تو سکھی فوجیں پھر جابجا پھرنے لگیں۔ چونکہ صوبہ لاہور کے پاس فوج بہت کم تھی۔ اس باب میں اس نے بادشاہ کی خدمت میں درخواست کی اور بادشاہ نے کابل سے ایک امیر نورالدین خان نام جنگی فوج کے ساتھ لاہور کو روانہ کیا۔ جب وہ سروار چناب سے اترا چڑت سنگھ سکرچکیہ سکھوں کے بڑے اجتماع کے ساتھ اس کے مقابل ہوا جب یہ خبر لاہور پہنچی خواجہ عبید خان اپنی فوج کے ساتھ نورالدین کی امداد کو گیا اور جنگ میں شکست کھائی نورالدین خان تو بھاگ کر جموں چلا گیا اور خواجہ عبید خان میدان میں کام آیا۔ اس کے مارے جانے کے بعد کابلی مل نائب صوبہ نے صوبے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اس کے (صفحہ ۱۴۳) وقت پھر سکھوں کی فوجوں نے آکر لاہور کو گھیر لیا اور کابلی مل کو کہلا بھیجا کہ قصابان گاؤکش کو جس قدر لاہور میں ہیں ہم کو دے دو یا قتل کر دو ورنہ ہم شہر کو لوٹ لیں گے۔ کابلی مل کو اس میں تساہل ہوا۔ آخر جب سکھ دہلی دروازے کو توڑ کر شہر میں داخل ہوئے اور شہر لٹنے لگے تو کابلی مل نے سکھوں کا کہنا مانا اور چند قصابوں کے ناک کان کاٹ کر شہر سے نکال دیا اور بڑی رقم نذرانہ کی دے کر سکھوں کو شہر سے نکالا۔ ایسی ایسی خبریں سن کر احمد شاہ پھر غضب میں بھر آیا۔ اس کے آتے ہی سکھ جنگلوں میں ایسے گئے کہ گویا سکھ پنجاب میں کبھی آئے نہ تھے چاروں طرف فوجیں مامور ہوئیں اور افغانوں نے ان کے مسکن و مکان ڈھونڈ کر سراغ

نکالے مگر کوئی سکھ دستیاب نہیں ہوا پندرہ روز بادشاہ شہر میں رہا آخر واپس چل دیا۔ کابلی مل بھی بادشاہ کے ہمراہ چناب تک گیا۔ بادشاہ کے شہر سے قدم رکھتے ہی سکھ آموجود ہوئے اور شورش برپا ہوئی کہ کابلی مل کو پھر لاہور آنا مشکل ہو گیا اور نہ آسکا۔ اس کے پیچھے مسمیان لہنا سنگھ دگوجر سنگھ و سوبھا سنگھ تین سکھ سردار لاہور پر چڑھ آئے، شہر والوں نے بعد لینے قول و قسم اس بات کے کہ شہر لوٹا نہیں جائے گا بلکہ رعایا کی حفاظت ہوگی شہر کا دروازہ کھول دیا۔ سکھوں نے شہر میں جاتے ہی غارت مچا دی عجب تک تھک نہ گئے باز نہ آئے۔ شہر کو لوٹ کر تینوں نے شہر کے تین حصے کر لیے اور اپنے اپنے حصے میں حاکم بن بیٹھے۔ مدت مدید تک یہ انتظام رہا اور لاہور کی رعایا ان کی ظالمانہ حکومت کی بلا میں مبتلا رہی۔"

سکھوں کے ایسے تمام وحشیانہ واقعات کو جو لاہور پر ان ایام میں رونما پذیر ہوئے للہ سوہن لال سوری نے اپنی کتاب عمدۃ التواریخ میں یوں بیان کرتا ہے یہ شخص مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں درباری مورخ تھا:۔ (دفتر اول ص۱۵۰)

"امیر خان پسر میر مو متحان را بر نظامت صوبہ دار ملی لاہور مقرر و معین گردانید بجز رسیدن میر مذکور سرداران عالی شان و سردار سنگھ صاحب بلند مکان و سردار ہری سنگھ و حقیقت سنگھ و سردار جیا سنگھ اہلو والیہ وغیرہ سرداران بر شہر لاہور تاختند و غنایم بے شمار و اسباب بسیار از قسم جواہرات و مبالغ نقدی و سلاح لایق بادشاہان و بہا بہاے ملبوس خاص سلاطین بدست آوردند و در خاطر حال و بال آسودگی دل و جان حاصل ساختند و علاوہ بر آں در تمام ممالک و اطراف پنجاب قابض و متصرف گشتند و تمام عمارات شہر اندرون و بیرون بآتش فنا سوختند و ہمگی اسباب متاع مردم ساکنان شہر بغاوت

دلتنگی رفتند چنانچہ قریب پانزده روز آتش جدال و قتال و نایره فساد و شورش بر خانمانہائے
مردم ساکنان روشن و مشتعل گشت و میر محمد خان بطریق سینہ زوری در اندرون شہر قائم و
مستقل گردید بحسب اتفاق خزانہ احمد شاه بسبیل امانت در قلعہ دار السلطنت لاہور افتاده
بود تمام ارکانات شہر لاہور قسم سادات و مشائخ و علماء و حکماء و غربا بایک دگر صلاح و مشورت
شمرده نمودند۔ کہ اگر تسلط و غلبہ سنگہان در اندرون شہر جلوه نمائش پذیرد بر تمام خزانہ بادشاہی
قابض و متصرف خواہند گردید۔ اصلاح صلاح آنست کہ چیزے نذرانہ برائے دفع
الوقتی حوالہ سنگہان عالی شان نموده شود موافق کنکایش و مشورت خودہا قریب سہ ہزار
روپیہ نقد نذرانہ سنگہان سموالکان فرمودند و سنگہان بعد از اخذ و گرفتن نذرانہ بمکانات
متصرفہ خودہا فروکش شدند نواب سربلند خان از استماع ایں خبر بدرجہ نہایت
مکدر و ملولِ خاطر گردید و بطرف یعقوب خان برادر زاده کریم داد خان و عظمت
خان درانی نائب گل محمد خان خزانچی نواب سربلند مرقوم نمود کہ میر محمد خان را محبوس
سازند و بسزائے کردار ناہموار رسانند و خود در بند و بست و نسق و نظام امورات متعلقہ
صوبہ لاہور سعی بسیار و کوشش بے شمار بروئے کار آرند چنانچہ مشار الیہم حسب موافق
ارقام نواب مسطور بعمل آوردند خود تنسیق تمام و نظام بالا کلام معاملات مقبوضہ لاہور
ساعی و سرگرم شدند۔"

اس مختصر متذکره بالا کیفیت سے جو زیاده تر قبل عہد رنجیت سنگھ سے تعلق رکھتی
ہے۔ اندازه کرنا چاہیئے کہ لاہور میں ہمارے آثاروں کے ساتھ کیا گذری ہوگی
اور کیا کیا اعلیٰ عمارتیں خاک میں مل گئی ہوں گی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا جس طرح
لاہور میں داخلہ ہوا وہ بھی ہم مطالعہ ذیل میں کرتے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا زمانہ

رنجیت سنگھ کا باپ مہان سنگھ جب ۱۷۹۲ء میں فوت ہوا تو رنجیت سنگھ کی عمر ۱۲ سال تھی۔ وہ باپ کا جانشین قرار پایا مگر ریاست کے معاملات زیادہ تر دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں رہے جن میں کھتری لکھپت رائے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ رنجیت سنگھ نے سترہ سال کی عمر کو پہونچکر تمام امور حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کی خواہش کی جسے اس کی والدہ اور لکھپت رائے پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر اسی اثناء میں زمان شاہ خان والی کابل سکھوں کی تنبیہہ و سرکوبی کیلئے جرار فوج لے کر پنجاب میں داخل ہوا۔ اس وقت سکھ لوگ پنجاب کے مختلف مقامات پر فرداً فرداً قابض تھے اور وہ شاہ زمان کے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ شاہ زمان نے لاہور میں قیام کیا مگر اسے ایک خاص امر کے لئے فوراً تمام معاملات کو ویسا ہی چھوڑ کر واپس کابل جانا پڑا اور لاہور میں اپنا ایک سپہ سالار چھوڑ گیا یعنی پنجاب میں سکھوں کا دور دورہ پھر ہوگیا یہ لمحہ رنجیت سنگھ کے لئے بہت ہی نیک تھا۔ کیونکہ شاہ زمان نے رنجیت سنگھ کو اس کی غرق شدہ توپوں کو دریائے چناب سے نکال کر کابل پہونچانے کے عوض پنجاب پر خود مختار حکومت قائم کرنے کو لکھا اور اس واقعہ سے عزت بخشی یعنی پنجاب کی زندگی میں ایک خاص ہیجان از سر نو آگیا۔

ادھر لاہور کی مسلم رعایا نے بالخصوص لاہور کے تین سکھ حاکموں، لہنا سنگھ، سوبھا سنگھ اور گوجر سنگھ جنھوں نے لاہور کو تین حصوں میں تقسیم کر کے لاہور کی حکومت کو ۱۷۶۵ء سے کر ۱۷۹۹ء تک سنبھالا تھا۔ ان کے

مظالم و تعدّی سے تنگ آ کر رنجیت سنگھ کے پاس درخواست کی کہ آپ لاہور میں بلا کھٹکے چلے آئیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ باقی سب کام ہم خود کریں گے۔ جب یہ درخواست رنجیت سنگھ کے پاس رام نگر مقام پر پہونچی تو اس نے قاضی عبدالرحمٰن باشندہ رام نگر کو میاں عاشق محمدؐ کے پاس زبانی امور طے کرنے کے لئے لاہور روانہ کیا۔ اس زمانہ میں لاہور میں دو مسلمان میاں عاشق محمد اور محکم الدین بہت ہی معزز شمار ہوتے تھے۔ میاں عاشق نے کہلا بھیجا کہ جب آپ آئیں گے۔ تو لاہور کا لوہاری دروازہ فوراً آپ کے لئے کھول دیا جائے گا۔ جب یہ حال لاہور کے تینوں حاکموں کو معلوم ہوا تو ان میں سے دو تو بھاگ گئے۔ باقی چیت سنگھ پسر لہنا سنگھ نے کوشش کی کہ وہ جلدی سے قلعہ میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کرے تاکہ رنجیت سنگھ داخل نہ ہو سکے، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اِدھر باہر سے رنجیت سنگھ کی افواج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چیت سنگھ مہاراجہ کی امان لے کر لاہور چھوڑ کر چلا گیا اور رنجیت سنگھ شہر پر قابض ہو گیا۔ غرضیکہ رنجیت کا ۱۷۹۹ء سے لاہور پر قبضہ ہو گیا اور رنجیت سنگھ اس وقت سے "سرکار" مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لقب سے خطاب کیا جائے لگا۔ رنجیت سنگھ نے ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کے جانشینوں کا عہد یعنی بد امنی کا زمانہ شروع ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے آخر پنجاب کا چارج مہاراجہ دلیپ سنگھ سے ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو لے لیا اور پنجاب دولتِ انگلشیہ کا حصہ بن گیا۔ یہ مختصر سی اطلاع سنگِ مرمر کی سل پر لاہور کے قلعہ میں شیش محل کی دیوار پر ثبت ہے۔

ولیم مور کرافٹ کا مشاہدہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ولیم مور کرافٹ مشہور سیاح لاہور میں ۱۸۲۰ء میں آیا اور اس کے بیان کو عام طور پر اس عہد سے متعلق بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ شخص بمقام لیورپول ۱۷۶۵ء میں پیدا ہوا۔ اس نے سلوتری کی تعلیم فرانس میں حاصل کی جس میں اس نے نام پیدا کیا۔ ۱۸۰۸ء میں بنگال آرمی کا سلوتری ڈاکٹر مقرر کیا گیا۔ اس نے ۱۸۱۱-۱۲ء میں کوہ ہمالیہ کو عبور کر کے دریائے اٹک اور ستلج کے منبوں کا سراغ لگایا۔ ۱۸۲۰ء میں وہ لاہور آیا اور یہاں سے وہ لداخ گیا اور ایک کے راستہ سے ہوتا ہوا براستہ پشاور و کابل بخارا پہونچا واپسی پر اندکوہی کے مقام پر اس کا انتقال ہو گیا۔ اور اسے بلخ میں دفن کیا گیا۔ اس کا سفرنامہ مسٹر ولسن کی ترتیب سے طبع ہو چکا ہے۔ اس مطبوعہ سفرنامہ میں لاہور کا ذکر اور مور کرافٹ کی رنجیت سنگھ سے ملاقاتیں بہت مفید حالات ہیں جسے ہم یہاں لاہور کی حد تک ترجمہ پیش کرتے ہیں وہ لکھتا ہے:-

...... ۶ رمئی ۱۸۲۰ء کو میں تین بجے (امرتسر سے ......) چلا اور ۹ بجے شالامار باغ پہونچا۔ یہ وسیع باغ شاہجہاں کے حکم سے تعمیر ہوا تھا جس کے ایک کمرے میں میں نے قیام کیا ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کنوئیں کے قریب ہی تعمیر کیا تھا جس سے حوض کو بھرا جاتا ہے جس سے فوارے چھوٹتے ہیں تاکہ اس سے اس میں داخل ہوتے وقت ٹھنڈک رہے رنجیت سنگھ نے بہت حد تک باغ کو مرمت بھی کرایا ہے۔ اس کا رقبہ سو بیگہ بیان کیا جاتا ہے ایک چار دیواری کے اندر کئی عمارات ہیں ...... (آگے چل کر مور کرافٹ بیان کرتا ہے) میرے پہنچنے کے بعد

اسی روز حکیم عزیزالدین کا بھائی میرے پاس آیا تاکہ وہ مجھے بارہ دری کی طرف راہنمائی کرے جو ایک اور باغ قلعہ کے قریب میں واقع ہے جس میں ایک چھوٹی سی تین منزلہ عمارت تھی۔ اس کا درمیانی حصہ بیشتر لکڑی کا مع دلوں یعنی خرپموں والا کے کھلے کام کا تھا ان کے نقوش کو چھوٹے چھوٹے پھولدار، جانوروں اور انسانی تصاویر کے حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس پر عمدگی سے چمکدار روغن کیا ہوا تھا۔ اس کی کارنس کو منقش اس طرح کیا ہوا تھا۔ کہ وہ لاجورد کے مرصع کے مثل نظر آتا تھا۔ ابھرے ہوئے نقش ونگار تھے اور ان کو چھوٹے چھوٹے آئینوں کی مرصع کاری سے مزین کیا ہوا تھا۔ اس میں گلٹ کی ہوئی جالیاں تھیں۔ اسی کا اثر دل کو بھانے والا تھا۔ ایک فوارہ ایک کھلے برآمدہ کی طرف جاتا تھا۔ جو اس حصہ کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس کی کھلی سطح چھت شبکہ دار جالیوں کٹہروں سے گھری ہوئی تھی جو موسم گرما میں خوابگاہ کے کمرہ کے مطلب کو پورا . . . . . . کرتی تھی . . . . . اسی مہینہ کی ۸ تاریخ کو حکیم میرے پاس رنجیت سنگھ کی بارگاہ میں مجھے لے جانے کے لئے آیا۔ مغربی دروازہ قلعہ سے گزر کر ہم نے باغ کو عبور کیا جس میں بادشاہی یا جامع مسجد کھڑی ہے۔ وہاں سے طویل اینٹوں کی سیڑھیوں کی چڑھائی سے دوسرے دروازہ اور صحن تک راہنمائی کی۔ ان سب کو عبور کرکے ہم شہر کے دروازہ تک آئے جو مزید کھلے صحن میں تھا۔ جس میں کافی مکانات اوندھے پڑے تھے۔ یہاں سے ہم ایک وسیع صحن میں جس میں سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ ایک طرف کرکے دروازہ کے بالمقابل ایک کھلا حصہ تھا جس میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نشست رکھتا تھا۔ میرے وہاں پہنچنے پر وہ اپنی کرسی سے کسی قدر اٹھا جو سونے کی تھی اور اس کے سامنے ایک اور کرسی چاندی کی بھی پڑی تھی۔ جس پر مجھے بیٹھنے

کے لئے اشارہ کیا۔ اس کے بعد مورکرافٹ بیان کرتا ہے، شام کے وقت نورالدین والیٔ لاہور میرے پاس مجھے شہر میں لے جانے کے لئے تشریف لایا۔ شہر لاہور قریباً بہت بلند فصیل سے گھرا ہوا تھا۔ جو قریباً سات میلوں پر پھیلی ہوئی ہے اور قلعہ کی عمارت سے مسلسل ملی ہوئی ہے۔ قلعہ کا وہ حصہ جس میں راجہ نشست رکھتا ہے معمولی مضبوط دیوار سے گھرا ہوا تھا جس میں فوجوں کے ٹھہرے اور پہرہ دینے کے لئے سوراخ وغیرہ ہیں۔ اس کے شمال کی طرف دریائے راوی بہتا ہے۔ مگر قلعہ کے کسی طرف خندق نہیں ہے اس احاطہ کے اندر جو محل ہے اسے ثمن دثمن) برج کہتے ہیں جس کی کئی منزلیں ہیں اور اس کی دیواروں پر کاشی سے نقش ونگار کیا ہوا ہے۔ ان نقوش میں جلوسوں، آدمیوں اور جانوروں کی کشتیوں کی تصاویر ہیں۔ ان نقش ونگار میں بعض اس قدر صحیح حالت میں ہیں جیسا کہ ابھی ان کو تیار کیا گیا ہے قلعہ کی اکثر قدیم عمارات کھنڈرات کی شکل میں ہیں۔ دیگر عمارات کو غفلت میں ڈال رکھا ہے رنجیت سنگھ نے ان میں سے بعض کے اینٹ پتھر کو صاف کر دیا ہے اور بعض تباہ حال عمارات کو جہانگیر اور شاہ جہاں نے مرمت بھی کیا ہے یا مطلب کے مطابق درست کیا ہے مگر ان تبدیلیوں کو کسی خاص ذوق اور زیادہ طریقہ سے نہیں کیا گیا۔ بڑے صحن اور بڑی مسجد (شاہی مسجد) کو انفنٹری کے قواعد کے لئے تبدیل کر دیا ہے۔ آصف خاں برادر نورجہاں کے روضہ کے سفید مرمر کو نوچ لیا ہے تاکہ ان کو کسی غیر اہم حصہ کی تعمیر یا مسجد کے باغ کے صحن میں لگایا جائے۔ دیوان عام ایک وسیع ہال ہے جو متعدد ستونوں پر کھڑا ہے۔ دیوانِ خاص چھوٹے چھوٹے کمروں کا مجموعہ ہے جو کوئی خاص امر پیش نہیں کرتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور ۱۲ میلوں کے محیط میں ہے۔ یہاں کوئی شاندار عمارت سوائے مسجد

وزیر خاں کے نہیں دیکھی۔ ۱۵۔ مئی ۱۸۲۰ء کو میں نے اپنا سفر بطرف کوہستان شروع کیا۔"

حضوری باغ کی تیاری

اس مختصر تفصیل سفر لاہور مورکرافٹ سے جو ہم اوپر درج کر چکے ہیں ہمیں لاہور کے حضوری باغ کا کسی قدر خاکہ ملتا ہے۔ جسے مورکرافٹ نے حضوری باغ کے نام سے یاد نہیں کیا بلکہ اس نے باغ صحن بادشاہی مسجد سے تعبیر کیا ہے نہ معلوم اس وقت حضوری باغ عام ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ ذیل میں ہم معاصر لالہ سوہن لعل سوری کی تاریخ عمدۃ التواریخ سے اسی حضوری باغ کے متعلق ایک اقتباس درج کرتے ہیں سمت ۱۸۶۹ جو زیادہ تر تیاری باغ سے براہ راست متعلق ہے۔

"ارشاد شدن سرکار عالی اقتدار بنا بر تیاری باغ حضوری مابین قلعہ و مسجد بادشاہی تماشہ میلے روز ہولی در روز نوروز جہاں افروز در لاہور وگذرانیدن دیوان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ارشاد واجب الاتقیاد سرکار رسالت دولت مدار بہ کار پردازاں امور ممالک محروسہ زیب صدور پذیر گشتند کہ باغ نو پائیں مسجد و قلعہ بنوری اور تیار و مرتب یابد گنانید لہٰذا باعیانان کامل الفن در تیاری باغ نو مستعد و سرگرم شدند روز ہولی بکمال زیبائش در لاہور زیب سرانجام یافت انعام و صلات متواترہ ولباس ہائے فتنکا شرہ حوالہ مصر یک متوسل خاص گردید روز نوروز بہروز سرکار بدولت مدار بکمال شان بر مسند دولت و اقبال جلوس میمنت مانوس فرمودند"

اسی طرح سوہن لعل سوری آگے چل کر سمت ۱۸۷۷ کے تحت پھر باغ حضوری میں

جشن نوروز کا ذکر کرتا ہے اور اپنی تفصیل باغ میں اب چاندی کے ایک بنگلہ کو نصب کر کے جشن کا منانا اور آراستہ کرنا یوں بیان کرتا ہے۔

صفحہ ۲۷۱ ۔ دفتر دوئم

دو نوروز نوروز سرکار دولت مدار بنگلہ نقرہ در باغ حضوری منتصب و برپا نمودہ مجلس جشن و نشاط آراستند و تمامی سرکردگان و وکیلاں و منشیاں قدر موافق استعداد خود ہا گذرانند)

اور سوہن لعل سوری نے اپنی کتاب عمدۃ التواریخ میں ولیم مورکرافت کی آمد کو یوں بیان کیا ہے۔

صفحہ ۲۷۵ دفتر دوئم

"بتاریخ بست و سوم ماہ مذکور خلیفہ نورالدین ولیم مورکرافت صاحب بہادر را باتفاق میر مذکور ولالہ خوشی وقت رائے در قلعہ بردہ مشرف بملازمت کیمیا خاصیت سرکار ذوالاقتدار گردانید و صاحب موصوف دو نیام طمانچہ عمدہ و تحفہ و ظروف چینی و بلورین بسا نید و سرکار دولت مدار کہ بر جمیع امورات ریاست واقف و ماہر اند بالفاظ شیریں تسخیر دلہائے فرمودند۔ صاحب مذکور کہ روز اوّل در ناحیہ شالہ باغ فرود آمد۔ مبلغ یک صد روپیہ در وجہ ضیافت حوالہ گشت و ہر گاہ در باغ جمادار معلوم قیام درزید۔ مبلغ سہ صد روپیہ فرستادند بعد ازاں مبلغ یک صد روپیہ یومیہ جلوہ استحکام پذیرفت۔ فرنگی معظم الیہ بتاریخ بست و ہفتم ماہ صدر روانگی صاحب مذکور بطرف ہنڈی لذاخ جلوہ نمائش خواہد پذیرفت"

اور اسی صفحہ پر اس نے اس کے سفر کو ایک طرح اختتام کو رنجیت سنگھ

کے تحائف سے یوں بیان کیا ہے۔

"میر عزت اللہ باتفاق ولیم مورکرافت صاحب بہادر تسمہ در لاہور قیام میداشت سرکار دولت مدار صاحب معز اللہ را تحائف حوالہ فرمودہ بطرف کوہستان منڈی وغیرہ روانہ گردانید دہم خلعت عمدہ حوالہ میر مذکور فرمودند"

آجتک باغ شالامار میں متذکرہ بالا کنوئیں پر ایک مرمری سل بر ولیم کرافت کا نام و تاریخ قیام باغ ہذا کی کندہ ہے۔

بارہ دری کی تعمیر

متذکرہ بالا بیانات متعلقہ تفصیل حضوری باغ اور بارہ دری سے کچھ پتہ نہیں چلتا کیونکہ وہ خود کہتا ہے۔ کہ اس کی تین منزلیں یا درجے ہیں اور بالخصوص درمیانی لکڑی کی ہے۔ پھر اس کی پوری تفصیل بھی دی ہے اور ادھر سوہن لعل نے خود لکھا ہے "کہ باغ حضوری میں ایک چاندی کا بنگلہ نصب کیا گیا۔ مگر ولیم مورکرافت نے صاف لفظ بارہ دری تین منزلوں والی لکھا ہے۔ حالانکہ سوری نے آگے چل کر بارہ دری کے متعلق سمت ۱۸۸۴ کے واقعات کے تحت صفحہ ۳۵۶ دفتر دوئم پر یوں لکھا ہے۔

"پروانہ بنام خلیفہ نورالدین صدور یافتہ کہ باراں دری حضوری باغ بر چبوترہ مسجد بادشاہی مرتب و تیار باید کنانید۔ بنا بر آں حسب التاکید سرکار عالی معماران کامل الفن راجہت تعمیر و ترمیم سرگرم گردانیدہ ......"

یعنی ولیم کرافت کے قریب سات سال بعد پہلی بار بارہ دری کی تیاری کا ذکر سوہن لعل کرتا ہے اور پھر ایک اور وضاحت کی ہے کہ چبوترہ مسجد بادشاہی پر تیار کیا جائے

اور اس کے لئے حکم بنام خلیفہ نور الدین صادر ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہاں اسی زمانہ میں ایسے نشیمنوں کے لئے لفظ بارہ دری عام ہو جیسے مورکرافت نے لکھا ہے اور سوہن لعل نے اسے احتیاطاً لفظ بنگلہ سے تعبیر کیا ہے۔ جس میں ولیم مورکرافت فرد کش ہوا تھا۔ اتفاق سے سوہن لعل سوری نے بارہ دری کی تکمیل تعمیر کو پھر آگے چل کر دفتر سوم ص ۶۱ حصہ اول پر یوں بیان کیا ہے۔

"در باغ بیرون قلعہ رونق بخش و باز در باراں دری حضوری باغ تشریف آوردند و گھوڑ چڑھا ہائے در گذرانیدن نذرات سعادت جاودانی حاصل ساختند وہم وکلائے اطراف بشرف ملازمت کیمیا خاصیت بہرہ اندوز شدند"

"کپتان ویڈ صاحب برزبان فراست بیان آوردامروز روز نیک و مبارک است چرا کہ وکیل بادشاہ لندن در حضور والا رسیدہ است زیادہ خوشی و فرحت چہ خواہد بود سرکار والا اقتدار فرمودند کہ ایں باراں دری حضوری باغ تعمیر کنانیدہ حضور والا است و سابق ازیں از ابتدائے دروازہ دہلی تا شالامار باغ تمام آباد و معمور بود باغات و حدائق دل کشا رشک افزائے خلا بریں بودند۔ کپتان ویڈ صاحب گفت کہ بار دیگر از یمن اقبال عدو مال سرکار والا مکانات عمدہ تیار و مرتب خواہند شد۔ بار دیگر تلفظ اثمار فرمودند۔"

راقم نے ابتدا میں لکھا ہے کہ نہ معلوم سکھوں کے عہد سے قبل یہاں کا نقشہ کیا تھا کچھ علم نہیں ہوتا مگر ایک بات کی طرف اشارہ ضرور ملتا ہے وہ یہ چبوترہ بادشاہی مسجد تھا جس پر یہ بارہ دری تعمیر ہوئی۔ نہ معلوم وہ کیا چیز تھی۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ولیم کرافت نے اسے ہرگز اینٹ یا سنگ مرمر کی تعمیر نہیں لکھا اور درمیانی منزل کو

صراحتاً لکڑی کی بیان کیا ہے اور پوری تفصیل دی ہے۔یعنی موجودہ تعمیر جو ہمیں نظر آتی ہے وہ ولیم مورکرافت کے بیان سے ہر حالت میں مختلف ہے۔ آج کی عمارت لالہ کنہیالال اپنی تاریخ لاہور میں ۱۸۸۴ء میں ذیل کی تفصیل اپنے مشاہدہ سے یوں بیان کرتا ہے اور اس کی حقیقت کو اور اس کے مصالح کی فراہمی کو عمدگی سے بیان کرتا ہے۔

کنہیا لعل کا مشاہدہ

اس بارہ دری کی تین منزلیں ہیں۔ایک منزل تو زیر زمین بطور تہ خانہ کے ہے۔اس کی خشتی عمارت ہے مگر چار دہلیزیں سنگ مرمر کی اس میں بھی لگائی گئی ہیں۔دوسری اور تیسری منزل کی عمارت سرتاپا سنگ مرمر کی ہے۔ باعث اس کی تعمیر کا یہ ہوا کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے قلعہ درمیانی مسجد شاہی و قلعہ لاہور میں باغ لگوایا۔ اور حضوری باغ اس کا نام رکھا۔ تو شوق دامن گیر ہوا کہ اس باغ کے وسط میں ایک عمدہ بارہ دری تعمیر ہو جو بعد ہمارے یادگار متصور ہو چونکہ اس وقت مسلمان امراء کے بے شمار سنگین روضے و مقبرے شہر کے باہر موجود تھے۔ حکم ہوا کہ ان کا پتھر اتروا کر اسی بارہ دری کی عمارت میں لگایا جائے چنانچہ پہلے سب سے پتھر زیب النسا کے مقبرے کا اتروایا گیا پھر مقبرہ شاہ شرف کا پتھر اترا یا جس کا مقبرہ دروازہ بھاٹی کے آگے تھا۔ علیٰ ہذا القیاس بہت سے مقبروں کے پتھر اتروا کر اس عمارت کو ختم کیا گیا۔اس پر بھی پتھر کی کمی رہی اور فرش زیریں درجہ دوم و سوم کا سنگین نہ بنا صرف چونہ کے فرش پر کفایت کی گئی۔

اس بارہ دری کی منزل زیریں یعنی تہ خانہ میں پندرہ سیڑھیاں اتر کر جاتے ہیں۔

یہ زینہ سنگِ سرخ کا بنا ہوا ہے ۔ سیڑھیوں کے آگے ایک درجہ بطور ڈیوڑھی کے ہے جس کے تین طرف دہلیزیں سنگ مرمر کی لگی ہوئی ہیں ۔ اس تہ خانہ کے وسط میں ایک درجہ ایسا بنا ہے جس کے بارہ در قالبوتی مرغولی ہیں یعنی تین تین در چاروں طرف خشتی بنے ہیں ۔ اور ہر ایک سمت غلام گردش جس کے اندر روشنی بذریعہ روشن دان کے آتی ہے جو اوپر کی منزل میں رکھے گئے ہیں دوسرا درجہ اس بارہ دری کا تین قطعوں میں منقسم ہے ۔ ایک باہر کا کھلا ہوا چبوترہ سنگِ مرمر کا عالی شان جو چاروں طرف بارہ دری کو محیط ہے ۔ یہ چبوترہ آٹھ فٹ چوڑا ہے اور تین فٹ زمین سے اونچا چاروں طرف اس کے وسط میں ایک ۱/۲ فٹ اونچا ایک اور چبوترہ اصلی چبوترے کی دیوار سے کچھ بڑھا کر بنایا ہوا ہے ۔ صورت اس کی مربع ہے ۔ اسی خورد چبوترے، کو شہ نشین بھی کہتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نشست بوقت دربار کے اسی چبوترے پر ہوتی تھی چبوترہ کلاں و خورد پر سنگِ مرمر کا فرش ہے ۔ جس میں اور پتھروں کی رنگ آمیزی ہے ۔ کلاں چبوترے پر جانے کے لئے دو دو سیڑھیاں سنگ مرمر کی ہیں ۔ جس کے چار چار زینے ہیں ۔ چاروں طرف آٹھ زینے بنائے گئے ہیں ۔ جب چبوترہ کلاں سے انسان گذرے تو بارہ دری کی اصلی عمارت شروع ہوتی ہے یہ قطعہ چبوترے سے دو فٹ بلند بنایا گیا ہے ۔ تین تین دہنی قالبوتی مرغولی چاروں طرف رکھے گئے ہیں ۔ دوہرے دوہرے ستون سنگ مرمر کے نہایت خوش نما منبت کار مرغول بھی سنگین خوش قطع اور تینوں دہنوں کی بغلوں میں ایک ایک دروازہ جس کو سنگ مرمر کی چوکھٹیں لگی ہیں ۔ اندر باہر عمارت سنگِ مرمر کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جشتی عمارت کہیں نہیں ۔ ان دہنوں سے جب اندر جائیں

تو دس فٹ زمین غلام گردش کی چھوڑ کر دوسری بارہ دری یعنی تیسرا قطعہ بارہ دری کا آتا ہے۔ اس کے بھی بارہ در یعنی تین تین در چاروں طرف اور ستون کھڑے دیواریں سنگِ مرمر کی چھتیں ہر ایک درجہ اندرونی بیرونی کی طلائی منبت کار آئینہ دار منقش بنی ہیں باہر کی طرف چھت کے برابر سنگ مرمر کا مندلان دار چھجہ بنایا گیا ہے۔ جس پر بطورِ منڈیر کے سنگِ مرمر کے ستون قائم کر کے بیچ میں پتھر کی جالیاں چڑھی ہیں۔ بارہ دری کے اندرونی دونوں قطعوں میں چونہ کا فرش ہے۔ اگرچہ فرش بھی پتھر کا ہوتا تو یہ بارہ دری گویا اپنی خوبی میں لاثانی ہوتی۔

تہ خانہ کے روشندان ہر ایک سمت پانچ پانچ ہیں اور بیرونی چبوترے پر ہر ایک سمت چار چار فوارے ہیں مگر اب سب فوارے ٹوٹ گئے ہیں۔ تیسری منزل پر جانے کے لئے سنگ مرمر کا زینہ بنا ہے۔ سولہ سیڑھیاں چڑھ کر انسان اوپر جاتا ہے تو وسط میں میدان سقف کے ایک بارہ دری سنگ مرمر کی مقطع نیچے کے اندرونی درجے کے اوپر بنی ہے۔ سقف کے میدان سے اس کا درجہ ڈیڑھ فٹ بلند رکھ کر بارہ دری کی عمارت شروع ہوئی ہے۔ اس بارہ دری کے بارہ در ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تین تین در ہر ایک سمت چھجہ بھی سنگِ مرمر کا بنا ہے۔ چھت آئینہ دار منبت کار مطلا منقش ہے۔ اس پر منڈیر بدستور درجہ زیریں کے ستون جما کر جالیدار بنائی گئی ہے۔ اس بارہ دری کی چھت اور نیچے کے درجہ کی چھت پر فرش چونے کا ہے۔ صرف بطور حاشیہ کے منڈیر کے ساتھ دو دو فٹ تک فرش پتھر کا ہے اور میدان میں سب چونہ لگایا گیا ہے۔

سید محمد لطیف کا مشاہدہ

سید محمد لطیف نے اپنی تاریخ لاہور کو ۱۸۹۲ء میں طبع کیا۔ وہ اسی حضوری باغ وبارہ دری کے متعلق لکھتا ہے :-

" اورنگ زیب کی سرائے بادشاہی مسجد کے مشرق کی طرف جو ہے۔ اس میں تاریخی ماحول ہے اس چار دیواری میں (جسے راقم نے مغلوں کی عمارتی روایات کو مدنظر رکھ کر لفظ جلوخانہ سے تعبیر کیا ہے) ایک باغ اور ایک "پیولین" بارہ دری ہیں۔ مغل عروج کے زمانہ میں اس میں فوجی دستے رہتے تھے جو شاہی جلوس کے لئے تھے۔ جبکہ بادشاہ شاہی مسجد میں نماز ادا کرنے جاتا تھا جس کے آگے آگے گرز بردار و عصابردار اور پیچھے امراء و روساء وغیرہ ہوتے تھے اور وہ راستہ جس سے اس کو گذرنا ہوتا تھا باقاعدہ پانی سے چھڑکا ؤ ہوتا تھا۔ جیسا کہ برنیئر سیاح فرانسیسی نے ایسے بہت جلوسوں کو بیان کیا ہے۔ اسی باغ کے جنوبی دروازہ سے ملحق جو دو منزلہ عمارت ہے جسے آج بطور بورڈنگ ہاؤس طلباء برائے نارمل اسکول استعمال کیا جاتا ہے اصل اقامت گاہ طلبا کے طور پر ان طلبا کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ جو شاہی مسجد میں اورنگ زیب کے زمانہ میں تعلیم حاصل کرتے تھے زمانہ مابعد میں اسے آبدار خانہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ یعنی یہاں پانی پینے کے لئے برائے محلات شاہی محفوظ رکھا جاتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اُسے گلاب خانہ کہا جاتا تھا۔ یہ گلاب اور بید مشک حکیم فقیر عزیز الدین اور نورالدین کی زیر نگرانی کشید کئے جاتے تھے بلکہ یہاں حکیم فقیر نورالدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکیم نے ادویات کا ذخیرہ جمع کیا

ہوا تھا اور مہاراج کے لئے خاص معجون تیار ہوتی تھی۔ مہاراج نے اس میدان کو جو مسجد اور قلعہ میں فصل پیدا کرتا ہے۔ ایک وسیع باغ میں منتقل کر دیا تھا اور اس میں ایک وسیع باغ میں منتقل کر دیا تھا اور اس میں ایک سنگ مرمر کا نشیمن یعنی بارہ دری تعمیر کی تھی۔ جو آج اس کے عہد کا تعمیری کارنامہ شمار ہوتا ہے یہ عمارت ۴۵×۴۵ فٹ لمبائی اور چوڑائی میں ہے یہ دو منزلہ عمارت مع زیر زمین کمروں کے ہے۔ اس کی چھتیں نہایت عمدگی سے گچکاری سے منقش کی ہوئی ہے اور ان میں چھوٹے چھوٹے شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ سمادھ رنجیت سنگھ اس کے قریب ہی ہے۔ اس بارہ دری کا مصالح نہایت بے دردی سے زیب النسا کی قبر نواں کوٹ۔ شاہ شرف کے روضہ سے جو ٹیکسالی دروازہ کے باہر ہے اور مسلمانوں کی دوسری عمارتوں سے نوچا گیا ہے۔ باوجود اس بربادی کے زمانہ میں اس عمارت کی دوسری اور تیسری منزل کے فرش چونہ کے ہیں۔ اور یہ عمارت عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ مگر خوبصورت اور موزوں عمارت ہے۔ یہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ بیٹھ کر سلطنت کا کاروبار اپنے وزراء کے ساتھ مل کر کرتا تھا۔ بلکہ شیر سنگھ بھی یہاں بیٹھتا تھا۔

متذکرہ بالا مشاہدات پر تبصرہ

متذکرہ بالا ہر دو بیانات لالہ کنہیا لعل اور سید لطیف ضرور خاصی دلچسپی کے حامل ہیں مگر ہر دو کی تحریریں آج کے ماحول کے مطابق ضرور تشنہ ہیں کیونکہ ہر دو نے کسی قسم کے باغ کے حوض یا فواروں کا ذکر نہیں کیا۔ راقم نے اس باغ کو خوب غور سے جس روز سے ہوش سنبھالی ہے دیکھا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ قلعہ

کے موجودہ دروازہ آمدورفت کے سامنے کسی قسم کی کوئی دیوار نہ تھی جیسی کہ آج ہے بلکہ اس دروازہ قلعہ کے سامنے سمادھ رنجیت سنگھ تک ایک کھلا میدان تھا کسی سکھ کا کوئی قبضہ نہیں تھا۔ جیسا کہ یہاں شائع شدہ نقشہ سے واضح ہے۔ روشنائی دروازہ سے برابر عام راستہ سیدھا دور تک چلا جاتا تھا اور ہم لوگ بلا کسی خوف اور کھٹکے کے یہاں پھرتے اور کھیلتے تھے بلکہ سمادھ کے اوپر کسی کو جانے کی رکاوٹ تک نہ تھی۔ نور احمد چشتی نے تو اپنی کتاب تحقیقات چشتی میں سمادھ کے نیچے ساتھ ساتھ عام دکانوں تک کا ذکر کیا ہے جن میں سبزی و دیگر اشیاء عام ملتی تھیں کیونکہ شاہی زمانہ سے شہر کا عام روشنائی دروازہ یہی تھا کی پابند کرنے کا مجاز نہ تھا۔ جسے سکھوں نے بغیر کسی اصول اور حق کے اپنی جائیداد قرار دیکر ایک احاطہ بنالیا ہے ادھر گورنمنٹ نے بھی اسی نقشہ کو نہیں دیکھا حالانکہ اسے قلعہ میں نہایت محفوظ کرکے موجودہ لکڑی کے پھاٹک کے آگے لوہے کا مضبوط دروازہ لگاکر بالکل بند کر لیا ہے یہ ایک واضح اور صحیح نقشہ سکھوں کے ان مکانوں کا ہے جس طرح وہ ان کو چھوڑ کر گئے تھے۔ اور انگریزوں کے ابتدائے عہد تک اسی طرح تھے۔

حضوری باغ میں اس نقشہ پر ایک کنواں مشرق کی طرف بھی دکھایا ہے۔ جو میرے خیال میں ۱۹۱۳ء تک تو ضرور قائم رہا۔ کیونکہ راقم چھوٹی عمر میں اکثر اس کنویں کے ساتھ کے چھوٹے سے حوض میں نہایا ہے اور اس میں عمدہ سنگ مرمر کی چادر لگی ہوئی تھی اور اس کنویں کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پانی سے تمام باغ سیراب ہوتا تھا۔ اور یہاں بہت سے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے جو زیادہ تر کھٹے وغیرہ پر مشتمل تھے۔

لاہور رنجیت سنگھ کے بعد
۱۸۴۹-۱۸۴۰-۱۸۳۹ء

(اردو ترجمہ)

معاصرانہ طور پر آسریبل مسٹر آسبرن نے ایک کتاب بعنوان "کیمپ وکورٹ رنجیت سنگھ" تالیف کی ہے جس میں مصنف نے مہاراجہ کی وفات کے بعد کے حالات لکھتے ہوئے جہاں اس نے نونہال سنگھ کی وفات اور شیر سنگھ کے واقعات کو بیان کیا ہے کہ وہ شیر سنگھ حضوری باغ کے دروازے میں سے داخل ہو کر ایک تہ خانہ میں مقیم ہو گیا اور گلاب سنگھ کو پیغام بھیجا کہ اب اطاعت قبول کرے اہل قلعہ کی یہ حالت تھی کہ دم بدم توپوں کے چلنے کے منتظر ہو رہے تھے اور آخر سکھ فوجوں نے دونوں طرف سے خوب تھک کر ۱۸ر جنوری ۱۸۴۱ء کو شیر سنگھ کو سلطنت پنجاب کا حاکم تسلیم کر لیا۔

لالہ کنہیا لال نے اپنی تاریخ لاہور (صہ ۳۴) صورت موجودہ شہر لاہور کے تحت لکھا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی چہل سالہ مدت عملداری میں یہ شہر لاہور بخوبی آباد ہو چکا تھا بیرونی کھنڈرات کی اکثر زمینوں میں امرائے دربار مہاراجہ نے بڑے بڑے باغ بنوائے تھے تو بھی بہت ہی زمین ناہموار و خراب پڑی ہوئی تھی جہاں پہلے بیرونی آبادیاں تھیں اور خشت فروشان شہر نے ان کی دیواروں کی بنیادوں کی اینٹیں نکالکر سفاک بدستور چھوڑتے تھے ہر چند چالیس سال تک بیرونی آبادیوں کی بنیادیں سکھی عہد میں کھودی گئیں اور بیس برس تک انگریزی عہد میں کھدتی رہیں مگر اینٹیں ختم نہیں ہوئیں۔ آخر انگریز نے بڑے بڑے سفاک بند کرا کر حکم

دے دیا کہ کوئی شخص زمین سے انیٹ نہ نکالے۔ کشمیر کے ملک سے جو آفت زدہ کشمیری آئے وہ لاہور میں آکر اینٹوں کے کھودنے اور بیچنے میں مشغول ہو گئے لکھ پتی بن گئے اکثر اینٹیں کھودتے وقت ان کو دفینے بھی حاصل ہوتے رہے۔

بارہ دری کی موجودہ حالت

لاہور کے لوگوں کو یہ بات بھولی نہیں کہ جب ۱۹۱۳ء میں لاہور میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ آیا تو اس نے محکمہ آثار قدیمہ کے ذریعہ اسی باغ میں بعض مقامات سے کھود کر قدیم حوض مع فوارے نکالے۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ مغرب کی طرف جو لمبا حوض ہے وہ اس وقت مع فواروں کے برآمد ہوا تھا۔ بلکہ قدیم زمانہ کا پانی بھی ابھی تک ان کے اندر نظر آتا تھا۔ اس کے بعد پھر باغ کے دونوں اطراف کے درمیان شرقاً غرباً حوض قائم کئے گئے۔ حالانکہ ہر دو لالہ کنہیا لال اور خان بہادر سید محمد لطیف اپنی تاریخوں میں کسی ایسے فوارے یا حوض کا ذکر نہیں کرتے یعنی یہ سب کچھ ان کے زمانہ میں نیچے دبا ہوا تھا اور اس کے بعد باغ کا توازن اور صحیح ماحول قائم رکھنے کے لئے اس کے قدیم کنویں کو اس وقت بند کر دیا گیا جو قلعہ کے اکبری دروازہ کے سامنے سڑک سے ملا ہوا تھا اور راہٹ سے چلتا تھا، اور اس کا راقم نے خوب مشاہدہ کیا ہے۔ اور جب کھدائی باقاعدہ شروع ہوئی تو ایک اور حوض باغ کے مشرق کی طرف قدیم کنویں کے قریب برآمد ہوا اور آج یہ حوض اسی باغ میں کسی موزونیت سے بھی صحیح نہیں بیٹھتا یعنی یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی طرح بارہ دری کے ساتھ کوئی متعلق نہیں رکھتا اور پھر اپنے ڈیزائن کے اعتبار

سے بھی سکھوں کی کسی عمارت کے مثل نہیں ہے بہرحال خفیکہ یہ قبل از تعمیر بارہ دری معلوم ہوتا ہے جب ہم عمدۃ التواریخ کے مندرجہ بالا الفاظ متعلق تعمیر بارہ دری پر غور کرتے ہیں کہ "یہ چبوترہ بادشاہی مسجد" پر تعمیر ہوئی اس پر مصالح یا اس کی جو شکل و صورت تھی وہ بھی مندرجہ بالا مؤرخین کے بیانات سے واضح ہے کہ کس طرح لاہور کی بہترین عمارات کو برباد کیا گیا اس لئے کیا عجب ہے کہ یہ چبوترہ بھی کوئی خاص عمارت کی حیثیت رکھتا ہو جس پر بارہ دری تعمیر ہوئی جسے تفصیل سے بیان نہیں کیا جس سے ہم کچھ اندازہ لگا سکیں۔

لارڈ ھارڈنگ آف لاہور

یہ شخص دراصل فاتح جنگ مدکی ہے جو ۱۸۴۵ء میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان فیروز پور میں بمقام مدکی واقع ہوئی اور اس سے سکھوں کا اقتدار بالکل ختم ہوگیا اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بھی ۱۸۴۹ء میں ختم ہو کر انگریزوں کا کھلی طور پر پنجاب پر قبضہ ہوگیا اور اس گھر سے کچھ کاغذات پرانے ملے تھے جو اس کا پوتا لارڈ ھارڈنگ وائسرائے (۱۹۱۲) لے کر یہاں آیا تھا اور اس کے مطابق ان فواروں وغیرہ کی کھدائی کی گئی جسے جان مارشل نے بھی مندرجہ ذیل رپورٹ میں واضح کر دیا ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ ۱۳-۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل محکمہ ہذا نے یوں بیان کیا ہے۔

"پنجاب میں مسلمانوں کے آثاروں کی جدوجہد کے ضمن میں جو خاص کر لاہور

تک محدود ہے۔ جہاں اس سال کے دوران میں حضوری باغ کی ترقی اور اس کو بہتر بنانے کا بہت بڑا کارنامہ تھا حال ہی میں یہ باغ جس کی رنجیت سنگھ کی مرمری بارہ دری بہت بڑا شاہکار ہے۔ اس کے موجودہ پلین ونقشہ میں کسی قدر رد و بدل کر کے از سر نو لگا کر نمائش کے قابل کیا گیا ہے۔ اس کی زمین کو کھود کر معائنہ کرنے پر فواروں کی قطاروں اور راستوں کے نشان برآمد ہوئے ہیں جو واقعی سکھ عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور ان آثاروں کی مطابقت سے اس باغ کو چار بڑی خیابانوں (روشوں) میں مع بیچوں بیچ چلنے والے راستوں کے فواروں والے طویل حوضوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان میں سے ہر خیابان کو بھی اسی طرح چھوٹے چار حصوں یا تختوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور روشنائی دروازہ کے ساتھ ٹریفک والا راستہ احاطہ باغ کے شمالی داخلہ تک تبدیل کر دیا ہے تاکہ باغ کے مربع شکل میں داخل ہو جائے۔ اس باغ کے لئے اچھے اچھے موزوں پودے اور بیلیں مہیا کی گئی ہیں۔ ان سب کو اس طرح آراستہ کیا گیا ہے۔ کہ مسجد جامع (بادشاہی مسجد) کا اعلیٰ تعمیری نظارہ مرکزی بارہ دری اور حضوری باغ کے دروازہ قلعہ کا منظر ایک دوسرے کے تعلق میں نہایت عمدگی سے مشاہدہ میں آ سکیں"

تعجب کی بات ہے کہ کسی نے بھی کسی فوارہ حوض یا باغ کی نہروں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ مورکرافٹ کے متذکرہ بالا الفاظ سے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ایک فوارہ ایک کھلے برآمدہ کی طرف چلتا تھا۔ ممکن ہے کہ مورکرافٹ کے اس فوارہ سے مراد وہی چار فوارے ہو سکتے ہیں۔ جن کے بارہ دری کے چبوترہ کے کونوں پر آج بھی نشان ملتے ہیں۔ غالباً اس نے اپنے مشاہدہ کے مطابق اسے بیان کر دیا ہے

اس موجودہ صورت ہیں باغ سے قبل جو حالت تھی اُسے کسی قدر اوپر واضح کر دیا ہے۔کہ بہت گھنے درختوں والا باغ تھا۔اس کے علاوہ کسی انگریز نے، ہندوستان کا سفر کر کے ۱۸۸۰ء میں ایک کتاب بعنوان .Picturesque پکچر سک انڈیا لکھی اس میں اس باغ کا ایک خاکہ بھی دیا ہے اور اس خاکہ سے بالکل واضح ہے۔کہ اس زمانہ میں بھی کثرت اشجاد وغیرہ کی وجہ سے باہر سے بارہ دری کا بھی دیکھنا ناممکن تھا۔

یہ بارہ دری بہت ہی عجیب وغریب عمارت ہے۔جس طرح یہ عمارت بیرونی طور پر نظر آتی ہے اسی طرح یہ نیچے بھی ہے۔یعنی جس قدر زمین کے اوپر بلند دو منزلہ نظر آتی ہے۔اسی طرح نیچے بھی اتنی ہی گہری دو منزلہ ہی زمین کے اندر ہے اور اس طرح دوسرا نیچے کا حصّہ دس فٹ نیچے ہے۔اور اوپر کا حصہ بارہ فٹ سے زیادہ ہے۔اور اوپر کا حصہ بطور غلام گردش بصورت برآمدہ نیچے کے حصے میں مشرق کی دیوار میں دو طاقچے ایسے ہیں جن سے روشندان کی طرح، نیچے پر کھڑا ہے جیسا کہ نقشہ سے واضح ہے۔پھر نیچے ڈھلوان سے جھرنے اوپر کو گئے ہیں۔اگرچہ آگے چل کر رک جاتے ہیں۔روشندان چاروں طرف الگ ہیں اور نہایت اعلیٰ اینٹوں کی تمام عمارت ستونوں پر کھڑی ہے جس طرح اوپر سنگ مرمر کے ستونوں پر کھڑی ہے نیچے مرکزی مربع سطح میں ممکن ہے کھودنے پر کوئی آثار یا پانی کی تہ برآمد ہو سکے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی باولی تھی جس پر یہ عمارت کھڑی کر دی گئی ہیں سوچتا ہوں کہ شاید یہ کوئی قدیم مقبرہ تھا جس کا یہ نیچے سردانہ ہے۔کیونکہ ایسے روضے آج بھی ملتے ہیں بہرحقیقہ یہ عجیب وغریب عمارت ہے۔ان سب کے علاوہ ۱۸۴۷ء یا ۱۸۴۸ء کی اس

کی چند تصاویر بھی ملتی ہیں۔ جس میں بارہ دری کی شکل و صورت آج سے کمی قدر مختلف ہے اور ان میں اس کے اوپر کوئی الگ کمرہ سا بھی نظر آتا ہے۔ میری مراد اس سے نہیں۔ جو ۱۹۳۲ء میں ضائع ہو چکا ہے بلکہ اس کے بھی اوپر الگ لکڑی کا ڈھانچہ نظر آتا ہے اور جب ہم اس کے مرمر کے پتھروں کے ٹکڑوں اور ان پر نقش و نگار کو دیکھتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں کہ اس کا کوئی حصہ بھی محض اس عمارت کی نیت سے نہیں بنایا گیا محض کہیں سے لا کر جس طرح اوپر بیان ہو چکا ہے یہاں جوڑ دیا گیا ہے۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے۔ کہ رنجیت سنگھ نے حضوری باغ کی بارہ دری کو جہانگیر کے مقبرہ سے اٹھا کر یہاں لا کر جوڑ دیا ہے مگر اس کے متعلق کسی قسم کا کوئی بیان یا تحریری شہادت نہیں ملتی رہ یہ نظریہ ابتدا میں میجر کول کا تھا جس سے اس نے بعد میں خود ہی اختلاف کر لیا۔ اور فنی روایات کے اعتبار سے بھی یہ ناممکن نظر آتا ہے۔

تبصرہ مؤلف

غرضیکہ میرا ذاتی خیال ہے کہ حضوری باغ میں بارہ دری کی جگہ پر قبل عہد سکھاں ایک عمارت۔ چبوترہ بادشاہی مسجد کے کے نام سے موجود تھی رجیسا کہ مصنف عمدۃ التواریخ کے الفاظ اوپر درج ہو چکے ہیں اور جو حوض آج مشرق کی طرف بغیر کسی موزونیت کے موجود ہے جو موجودہ عمارتی ماحول کے خلاف ہے۔ وہ سکھوں کے عہد سے قبل کی عمارت ہے اور ہم ان تمام عمارات کے متعلق کسی قسم کی قیاس آرائی

نہیں کر سکتے ہاں ہمیں یہ ضرور باور کرنا پڑے گا کہ رنجیت سنگھ نے اس بارہ دری کو قائم ضرور کیا تھا۔ جس پر لاہور کی اکثر مغل عہد کی عمارات کا مصالحہ صرف ہوا۔ ساتھ ہی ان سب کے علاوہ لاہور میں ایک عمارت بہت عالی شان "خانہ آصف" یعنی محل آصف خاں برادر نور جہاں و خسر شاہ جہان لاہور میں موجود تھا جو لاکھوں روپیہ کی لاگت سے زیر نگرانی احمد معمار لاہوری تعمیر ہوا تھا۔ جس کی طرف بعض لکھنے والوں نے تاج محل آگرہ کی عمارت کو منسوب کیا ہے۔ اور یہ محل لاہور میں آصف خاں کی وفات ۱۰۵۳ء کے بعد شاہ جہان نے شہزادہ دارا شکوہ کو عطا کر دیا تھا۔ بلکہ خود ایک مزید رقم کثیر دے کر اس محل میں ضرورت کے مطابق، رد و بدل کروا دیا تھا اور آج اس محل کا نام و نشان لاہور میں باقی نہیں ہے اور نہ ہی آج اس کے صحیح مقام کا کوئی علم ہے چونکہ دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان شدید قسم کی بوجہ مساوی حقدار تخت و سلطنت ہونے کے عداوت تھی۔ جس وجہ سے دارا شکوہ کا جو انجام ہوا۔ اس کے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ وہ محل بھی شکست و ریخت ہو کر اس کی جگہ آج اس موجودہ بادشاہی مسجد نے لے لی ہو۔ جسے اورنگ زیب کے رضاعی بھائی فدائی خاں کوکا نے ۱۰۸۴ء میں تعمیر کیا تھا۔ جس پر بھی جو کچھ سکھوں کے عہد میں ان کے ہاتھوں سے گذرا۔ آگے بیان ہوگا۔

سکھوں کا فنِ تعمیر

سمادھ گورو ارجن دیو اور سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ ہی کو یہاں کسی قوم کے طرزِ تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ سکھوں نے کوئی اپنا طرزِ تعمیر پیش نہیں کیا جو ان

سے فوراً منسوب کیا جاسکے۔ اس کے ثبوت میں بھی دو نہ متذکرہ عمارتیں سمادھ گوروارجن اور سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو پیش کرتا ہوں اوّل تو لاہور کے قلعہ کے شمال مغربی کونہ کے مقابل ہے اور دوسری بادشاہی مسجد کے شمال مشرقی کونہ کے باہر واقعہ ہے محض ایک دیوار حائل ہے میں اپنے ملک کے باشندوں سے پوچھتا ہوں کہ اگر ان کو پہلے یہ علم نہ ہو کہ یہ کوئی سکھ عمارتیں ہیں تو وہ فوراً ان کو اسلامی روضے شمار کریں گے۔ کیونکہ ان کی وہی کرسی۔ وہی دہن ہیں سہ ہی کمانیں یا محرابیں ہیں پھر وہی ان کے اوپر کی طرف بڑھتے ہوئے درجے ہیں اور ہر منڈیر پر کوئی نہ کوئی برجی ہے حتیٰ کہ ہماری نظر آخیر بلب نما پھل دار گنبد تک پوہنچتی ہے غرضیکہ یہ سب وہ امور ہیں جو اسلامی عمارت کے امتیازات ہیں میں نے اکثر بعض غیر ملکی لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ عمارتیں اسلامی نہیں ہیں مگر انہوں نے انہیں تاریخ کی روشنی میں تو سکھ عمارتیں قبول کیا مگر طرز تعمیر سے ہرگز نہیں۔ کسی قوم کے فن تعمیر میں محض مقبرہ ہی عمارت ہے جس میں وہ قوم اپنا طرہ امتیاز دل کھولکر پیش کرتی ہے۔ غرضیکہ یہ دو عمارتیں ایسی لاہور میں ہیں جو اسی عہد کا آئینہ ہیں۔ یہاں اگر ہم دربار امرتسر کا ایک مشاہدہ کریں جس کی روائتی طور پر بنیادیں حضرت میاں میر صاحبؒ نے رکھی تھیں۔ وہاں بھی وہی بخارچے۔ محراب دار دھن اور جالیاں ہم کو ملیں گی جو دور سے ایک اسلامی عمارت نظر آتی ہے۔

بلکہ بارہ دری حضوری باغ جو رنجیت سنگھ کی طرف منسوب ہے اس کا مشاہدہ بھی واضح کردیگا کہ یہ ایک خالص اسلامی عمارت ہے اس سے بڑھکر اس کا تمام پتھر دوسری اسلامی عمارتوں سے لیا گیا ہے ذرا غور سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ

بارہ دری کے کسی حصہ میں ایک پتھر سے دوسرا پتھر جوڑ نہیں کھاتا ہے اور یہاں ثبوت بہم مل جاتا ہے کہ یہ دوسری عمارتوں کے سامان سے تعمیر ہوئی ہے۔

لاہور کے گرد و پیش

متذکرہ بالا حضوری باغ اور بارہ دری کی تیاری کے ضمن میں مورخین لاہور نے بہت سی ان عمارات کا ذکر کیا ہے جہاں سے ان کی تعمیر میں مصالحہ لاکر استعمال کیا ہے اس لئے ان عمارات کی مختصر کیفیت پیش کرنا لازمی ہے تاکہ قارئین کرام کے سامنے ان کی اصل حقیقت اور تاریخی عظمت کا خاکہ آجائے کہ ان کے مٹ جانے سے کیا نقصان ہوا ہے مگر ان کو سمجھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے گرد و پیش (Panorma.) کا نقشہ بھی پیش کیا جائے جبکہ سکھوں کی حکومت کا خاتمہ ہو رہا تھا جیسا قلعہ کے گرد و نواح کا نقشہ ہم ابتدا میں پیش کر چکے ہیں۔ حسن اتفاق سے لاہور میں ۱۹۲۵ء میں ایک جلسہ ہسٹاریکل ریکارڈ کمشن کا ہوا جس میں ۱۸۴۴ء کا تیار کیا ہوا نقشہ لاہور گورنمنٹ کے ریکارڈ سے نمائش میں پیش کیا گیا جس کا طول قریباً چار گز تھا جس میں شہر کی اندرونی اور بیرونی آبادی کی ترتیب اس طرح تھی اور یہ نقشہ بصورت نظارہ زیادہ تر شمال سے پیش کیا گیا ہے۔

قلعہ کا شاہ برج، مسجد بادشاہ عالمگیر۔ ان کے عین نیچے دریائے راوی دکھایا گیا ہے۔ ڈیوڑھی تھور کوٹ، سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ دروازہ مسجد اس کے نیچے سڑک۔ دروازہ روشنائی برج راجہ سوچیت سنگھ۔ اس کے نیچے باغیچہ مہر نور اللہ۔ دروازہ مکتیانی (قلعہ) سمن برج۔ مکان بادشاہ ڈیوڑھی خاص صحن ڈیوڑھی

سفید سنگھ لال برج ۔سواری جلوس لاٹ صاحب ۔باغیچہ برج سیاہ نوساخت،
جواہر سنگھ ۔خواب گاہ سنگ مرمری ۔سمادھ بھائی وسطی رام ۔برج سرکاراں حویلی
چندکور ۔بالائی تخت ۔خواب گاہ کہنہ کلاں ڈیرہ قادری صاحب بہادر ٹھاکر دوالہ
بر تخت بنگلہ حویلی سرکارانِ کشمیر ۔توپ خانہ مرزا مظہر علی بیگ محل اکبری ۔طویلہ
اکبری شاہ برج قلعہ دروازہ بھیا رتنا ۔مسجد کنا منجرین ۔سمادھ جواہر سنگھ
دروازہ بیرون مستی ۔دروازہ ہتور کورٹ ۔ مستی دروازہ بشوالہ گلاب رائے۔
حویلی سردار تیجا سنگھ تکیہ فضل شاہ ۔حویلی سردار خوشحال سنگھ دروازہ تھور کوٹ کشمیری
حویلی بھگت رام ۔حویلی جرنیل مہتاب سنگھ مسجد وزیر خاں ۔دروازہ تھور کوٹ حضری
حویلی سردار اہلو والیہ ۔حویلی خان بہادر حویلی کرنیل مہیا سنگھ ۔شاہ برج دروازہ زکی۔
غرضیکہ متذکرہ بالا عمارات لاہور اس نقشہ میں نہایت عمدگی سے بصورت نظارہ
رنگوں میں بعہد سکھاں ۱۸۴۴ء میں پیش کی گئی ہیں۔

بادشاہی مسجد

اس جامع مسجد بادشاہ اورنگ زیب کی تعمیر کردہ کا ذکر ضمناً متذکرہ بالا سطور
میں آچکا ہے جیسے اورنگ زیب نے لاہور میں قلعہ کے اکبری دروازہ کے سامنے
۱۶۷۴ء میں تعمیر کیا اور اس کی تعمیر اورنگ زیب کے رضائی بھائی فدائی خاں کوکہ
کے زیر نگرانی ہوئی جبکہ وہ لاہور کا گورنر تھا اور یہ مسجد تمام عالم کی موجودہ مساجد
میں سب سے بڑی ہے۔
مگر سکھوں کو اس مسجد سے اپنے زمانہ میں خاصکر رنجیت سنگھ کے عہد میں تعلق

رہا ہے کیونکہ اس کے عہد میں یہ مسجد بطور فوجی چھاؤنی استعمال ہوتی رہی۔ مسجد کے سامنے باہر حضوری باغ کے وسط جو دراصل جلوخانہ تھا بقول سوہن لال سوری مؤرخ عہد رنجیت سنگھ ایک چبوترہ کہلاتا تھا جس جگہ پر بارہ دری بنائی گئی نہ معلوم وہ چبوترہ کوئی خاص عمارت تھی جسے مسمار کر کے بارہ دری قائم کی گئی اور اب اس کا ایک حصہ غالباً ایک حوض رہ گیا ہے کیونکہ ولیم مورکرافت نے جو تفصیل اس کی پیش کی وہ موجودہ سے بالکل مختلف ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ جب ولیم مورکرافت آیا تو بارہ دری کی جگہ کوئی قدیم عمارت تھی کیونکہ موجودہ بارہ دری اس کے بعد کی تعمیر ہے جیساکہ اوپر درج کیا جا چکا ہے۔

بہر حال سکھوں کے زمانہ میں جسے ہم ۱۷۶۱ء سے شمار کرتے ہیں مسجد کا ذکر بہت کم ملتا ہے اور نہ کوئی تحریر ملتی ہے مگر یہ واضح ہے کہ شاہ عالم ۱۷۱۲ء میں لاہور میں فوت ہوا جس کے نام پر آج لاہور کا ایک دروازہ شاہ عالمی کہلاتا ہے اگرچہ اسے پاکستان کے ظہور میں آنے پر مٹا دیا گیا ہے اس کے بعد فوراً سکھ پہاڑوں سے نمودار ہوئے اور نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ ایک قابل ترین صوبیدار پنجاب تھا اس نے سکھوں کو گورداسپور پر شکست دی مگر اس کی وفات (۱۷۱۷ء) پر اس کا لڑکا نواب ذکریا خاں حاکم ہوا جس نے ۱۷۳۸ء پنجاب کو سنبھالا جسے زمانہ امن شمار کرتے ہیں اور مسجد برابر استعمال ہوتی رہی مگر ۱۷۴۰ء میں نادر شاہ والئی کابل حملہ آور ہوا نواب ذکریا خاں نے صلح کرنی چاہی مگر اس نے دہلی کا راستہ اختیار کیا اور سکھوں نے پھر شور مچایا تو احمد شاہ ابدالی نے حملے شروع کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کی حکومت کو ۱۷۹۹ء میں ہاتھ میں لیا جیساکہ

اوپر درج ہے کہ اس کے عہد میں ولیم مورکرافٹ یہاں آیا جو مہاراجہ سے یہاں ملا اس کے الفاظ سے واضح ہے کہ :-

"عظیم الشان صحن اور مسجد کے بڑے حصہ کو سپاہی فوج کے قواعد کے میدان میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

مگر جب مہاراجہ کا انتقال ہوا تو اس کی راکھ کی ایک سمادھ مسجد کے مشرقی شمالی کونہ پر بنائی گئی اور آج یہ عمارت بذات خود ایک اسلامی حصہ ہے کیونکہ سکھوں کا اپنا کوئی طرز فن تعمیر نہیں ہے اسلئے انہوں نے اس زمانہ کے طرز کو ہی جو اسلامی طرز تھی۔ اختیار کر لیا مگر مسجد اسی طرح رنجیت سنگھ کے جانشینوں کے قبضہ میں رہی اور کوئی مسلمان مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور سکھوں نے نہایت آزادی سے اس مسجد کے ساز و سامان و پتھر کو خراب کیا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۸۴۰ء میں مسجد کے میناروں کی برجیاں بھونچال سے گر گئی تھیں ان میناروں پر راجہ شیر سنگھ نے جو رنجیت سنگھ کا دوسرا لڑکا تھا جنوری ۱۸۴۱ء میں اپنے برقندازوں کو تعین کر دیا تھا جنہوں نے کھڑک سنگھ جانشین اور لڑکا رنجیت سنگھ کی بیوہ مہارانی چند کور کے حامیوں کو بھگا دیا تھا مگر جب ہری سنگھ لڑکا دھیان سنگھ نے شیر سنگھ کے قتل کے بعد سندھیا والا کا محاصرہ کیا تو اس نے بھی یعنی ہلکی توپوں کو مسجد کے میناروں پر رکھ کر استعمال کیا جن سے قلعہ پر قبضہ کیا گیا تو ہری سنگھ باپ کی جگہ وزیر ہوا مگر جب انگریزوں نے سکھوں کو ہر میدان میں شکست دیدی تو برٹش فوجیں سر ہنری لارنس کی قیادت میں بادشاہی مسجد میں داخل ہوئیں تو انہوں نے مسجد اور حضوری باغ کا قبضہ حاصل کر لیا۔ اور ان کی سہولت کے لئے مسجد کے

دالانوں میں کچھ کھڑکیاں اور کچھ بارکیں بنائی گئی تھیں۔ اور برٹش فوج مسجد کے جنوبی دروازہ قلعہ کے دروازہ اور شمال میں روشنائی دروازہ سماد ھ پر تعین کی گئی اور بارہ دری میں دفتر قائم کیا گیا تھا۔ تب اس وقت یہ بھی تجویز کیا گیا کہ ایک پختہ دیوار قلعہ کے دروازہ اور اشتھان کے درمیان کھڑی کردی جائے تاکہ قلعہ بالکل الگ ہو جائے اس کے بعد سر ہنری لارنس اور دوسری برٹش افسر قلعہ میں داخل ہونے اور قلعہ کو نہایت احتیاط سے ملاحظہ کیا۔ ہر مقام وحصہ کو دیکھنے کے بعد جس میں خندق دشمن برج شیش محل وغیرہ سب شامل ہیں تب حکم دیا کہ قلعہ کا یہ تمام ملحقات کے ایک نقشہ تیار کیا جائے جو آج بھی موجود ہے یعنی یہ تمام نقشہ آج بھی اس وقت کے تمام سکھ آثاروں کا صحیح تعین کرنے میں ایک بہت بڑا صحیح ذریعہ ہے مگر غور سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جو آج سکھوں کے آثار قلعہ کے سامنے یا اِدھر اُدھر نظر آتے ہیں تمام مداخلت بے جا ہیں۔ متذکرہ بالا دیوار کو پاکستان کے فوراً بعد صاف کر دینی چاہیئے تھی۔

برٹش کے قبضہ کے بعد ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو ایک دربار لاہور میں ہوا تو پنجاب کے قبضہ کا اعلان ہوا اور شہزادہ دلیپ سنگھ کو مع اس کی والدہ مہارانی جندکور جنداں کو انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ یہ اطلاع آج بھی قلعہ کے اندر شیش محل کی دیوار پر پنگ مرمر میں کندہ ہے۔

اس زمانہ سے مسجد کا ریکارڈ برٹش کے دفاتر میں موجود ہے جن سے کسی قسم کی شہادت نہیں ملتی کہ یہ مسجد کس خاندان کے قبضہ میں تھی یا کون متولی تھا ممکن ہے یہ تمام کاغذات ضائع ہوگئے ہوں اس کے بعد آہستہ آہستہ مسجد کے واگذار اور مرمت کی طرف توجہ ہوئی جسے راقم نے مسجد کی تاریخ میں مفصل بیان کیا ہے مگر ۱۸۵۶ء میں

روبرٹ منٹگمری چیف کمشنر نے مسجد کو مسلمانوں کے نمائندوں حکیم سید ولی شاہ اور حکیم سید بزاگ شاہ کے حوالے کر دیا اور مسلمانوں نے مسجد کا قبضہ دراصل برائے ادائیگی احکام مذہبی قریب ایک صدی کے بعد لیا یعنی اتنا عرصہ مسجد ویران پڑی رہی جیسا کہ سطور بالا سے واضح ہے۔ مسجد کے اندر خاصکر شمال کی جانب بہت ہرے ہرے پیپل کے درختوں کی قطار تھی جو مسجد کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی تھی بلکہ مسجد کے بڑے دروازے کے ذرا باہر صحن میں بہت بڑا بڑھ کا درخت تھا اور اسی طرح جنوب مشرقی کونہ صحن میں بھی پیپل کا درخت تھا میرا خیال ہے یہ ۱۹۲۵ء کے بعد صاف کرائے گئے جب مسجد محکمہ آثارِ قدیمہ کی طرف سے ایک محفوظ آثار قرار دی گئی۔

مگر اس مسجد کے ضمن میں انجمن اسلامیہ کی خدمات کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے خاص کر اس انجمن کے سیکرٹری خان بہادر برکت علی خاں مرحوم جو یوپی کے ضلع شاہ جہان پور کے باشندہ تھے اور آج اس انجمن کے صدر میاں امیر الدین صاحب ہیں ہاں ایک امر مزید وضاحت کا محتاج ہے کہ مسجد کے دالان جو مشرق کی طرف یعنی قلعہ کے مقابل تھے انگریزوں کے ابتدائی زمانہ میں صاف کرائے گئے تھے اور اسی طرح اس جلوخانہ کی جنوبی دیوار کا حصہ جو قلعہ کی دیوار سے مس کرتا ہے لارڈ کرزن کے زمانہ میں گرادیا گیا تھا۔

آثارِ متعلقہ گوردوارجن دیو

لاہور میں قلعہ کے قریب میں سکھوں کا ایک گوردوارہ عام طور پر سمادھ گوروارجن دیو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس کے مغربی و جنوبی کونہ میں سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ

بھی ہے۔ گورو ارجن عام طور پر پانچویں یا چوتھے گورو شمار ہوتے ہیں اور آدی گرنتھ آپ نے ہی تالیف فرمائی تھی اور سکھوں نے آپ کی سمادھ لاہور کے متعلق عام طور پر یہ لکھا ہے۔

"گوردوارہ ڈیرہ صاحب متصل شاہی
قلعہ شری گورو ارجن دیو جی مہاراج کا
شہید استھان ہے۔"

اگرچہ کسی مستند کتاب یا تحریر سے آپ کی سمادھ یا گوردوارہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہاں سیاسی طور پر یہ بھی مشہور ہے کہ آپ نے جہانگیرؒ کے زمانہ میں بغاوت میں حصہ لیا بلکہ شہزادہ خسرو کی اپنے باپ شاہنشاہ جہانگیرؒ کے خلاف بغاوت میں مدد کی رحسن اتفاق سے جہانگیرؒ نے خود آپ کے متعلق اپنی توزک میں جو لکھا ہے۔ اسے یہاں ذیل میں قارئین کرام کی خاطر نقل کیا جاتا ہے جسے عام طور پر لکھنے والے نظرانداز کر دیتے ہیں، اس سے سیاسی پس منظر پوری طرح سامنے آجائے گا اور لاہور کی تاریخ کا وہ حصہ جو سکھوں سے متعلق ہے زیادہ واضح ہو جائے گا تب ان آثاروں کی حقیقت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ جہانگیرؒ اول سال عہد کے واقعات میں لکھتا ہے:۔

"موضع گوبند وال میں جو دریا بیاہ (بیاس) کے کنارے واقع ہے ایک ہندو ارجن نامی لباس فقیری رکھتا تھا بہت سے بے وقوف ہندو مسلمان اس کے اس کی بزرگی کی وجہ سے مرید اور معتقد تھے۔ اس نے اپنی ولایت مشہور کر رکھی تھی جس وجہ سے سب لوگ اس کو گرد کہتے تھے۔

اور اطراف و جوانب سے لوگ اس کے معتقد ہو کر
آتے تھے یہ دوکان اس کی تین چار پشت سے گرم تھی
اور میں (جہانگیر) بہت دنوں سے سوچتا تھا کہ اس
کی اس جھوٹی دوکان کو برطرف کر دوں یا مدد الٰہی سے
اس کو مسلمان کروں یہاں تک کہ جب ان ایام میں
خسرو (میں جہانگیر) نے اس راہ (گوئندوال) سے
گذر کیا تو اس مجہول نے اس سے ملنے کا ارادہ کیا اتفاق
سے اس کے مقام پر جا کر خسرو مقیم ہوا اس (گرو) نے
باہر نکل کر اس سے ملاقات کی اور کچھ فریب آمیز باتوں
سے اس سے وعدہ کیا اور اس کی پیشانی پر انگلی سے
زعفران کا قشقہ کھینچا اور اس کی اس حرکت سے خسرو نے
نیک شگون اپنے مقاصد میں حاصل کیا جب میں نے
اس کی یہ باتیں سنیں اور پہلے بھی مجھے اس سے زیادہ
واہیات معلوم تھیں تو میں نے اس کو حاضر کرنے کے
لئے حکم دیا اس کے تمام گھر بار اور تمام متعلقات کو
فرید مرتضیٰ خاں کے حوالے کر دیا اور فرمان دیا کہ اس
کے اسباب کو ضبط کر کے قبضہ میں لے لیا جائے اور
بوجہ سیاست اس کا خاتمہ کریں۔"

اتفاق سے اس واقعہ کو دبستان مذاہب میں یوں لکھا ہے جو کسی قدر معاصرانہ

حیثیت رکھتا ہے:۔

"جب جنت مکانی نورالدین بادشاہ نے اپنے لڑکے
شہزادہ خسرو کو اس قصور میں گرفتار کیا کہ وہ اس سے
باغی ہو گیا ہے تو گرو ارجن مل نے اس شہزادہ پر دعائے
خیر بھی پڑھی تھی جس کی پاداش میں بادشاہ نے گرو پر ایسا
سخت جرمانہ کیا کہ گرو اس کی ادائیگی میں عاجز آ گیا آخر اس کو
باندھ کر ریگستان لاہور میں پھرایا اور وہ شدت آفتاب
اور سختی غصلتوں سے مر گیا۔ یہ قصہ ایک ہزار پندرہ ۱۰۱۵ھ
ہجری کا ہے............"

سکھ حضرات نے لکھا ہے کہ گرو کو چندو لعل کی حراست میں رکھا گیا جو لاہور میں بہت زبردست آفیسر تھا اور گورو کا بہت بڑا دشمن تھا۔ کیونکہ اس نے اس کی لڑکی کے ناطہ کو رد کر دیا تھا۔ گورو چندو لعل کے مکان کے نیچے ایک کوٹھری میں ہی بند تھا۔ اسے طرح طرح سے اذیت پہونچائی گئی، آخر گورو نے اسی عذاب میں جان دے دی اور اس کی راکھ کو راوی میں پھینک دیا گیا جو قلعہ کی دیوار کے ساتھ ہی بہتا تھا، چنانچہ اسی مقام پر یہ سمادھ بنا دی گئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ گرو نے راوی میں اشنان کی اجازت طلب کی تو اسے پہرہ داروں کی زیر نگرانی اشنان کی اجازت ملی مگر وہ، راوی کے بہتے پانی میں غرق ہو گیا پھر نہیں ابھرا۔

غرضیکہ کسی مستند تاریخ یا کسی معتبر تحریر سے کسی قسم کی کوئی اطلاع اس ضمن میں نہیں ملتی کہ یہاں لاہور میں کبھی اس قسم کی سمادھ یا یادگار قائم کی گئی تھی سوا اس

کہ سید لطیف نے اپنی تاریخ لاہور میں لکھا ہے :-

"سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سامنے حضوری باغ
سے پریڈ کو جاتی ہوئی سڑک پر سمادھ گورو ارجن،
مل پانچویں گورو کی ہے .... سمادھ کو مہاراجہ
رنجیت سنگھ نے تعمیر کیا تھا"

اگر کوئی استھان یا کوئی یادگار تھی بھی تو بہت معمولی کیونکہ مقام کا تعین ہی نہیں ہو سکا اور نہ ہو سکتا ہے۔

سنہری مسجد کا قرب

سنہری مسجد لاہور شہر کے عین وسط میں ڈبی بازار میں آج بھی موجود ہے اور خوب آباد ہے۔ اس کی تعمیری خوبیاں پھر کبھی بیان ہوں گی مگر اس کی مختصر تاریخ اور بانی سے متعلق لالہ سوہن لعل سوری نے اپنی تاریخ عمدۃ التواریخ میں جو بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے اس کا بانی نواب میر سید بھکھاری خاں امیر الامرائے عہد میر معین الملک المشہور بہ میر منو شاہ بادشاہ کے عہد میں بعہدہ نائب صوبیدار دفتر پنجاب ممتاز تھا جب اس کا ارادہ تعمیر مسجد کے لئے مستحکم ہو گیا تو میر منو صوبہ لاہور کی خدمت میں درخواست کی کہ چوک واقع کشمیری بازار میں اس کو زمین تعمیر مسجد کے لئے عطا ہو چنانچہ یہ مسجد ۱۱۶۳ھ (سمت ۱۸۱۰) تیار ہوئی جو اس مسجد کے ماتھے پر آیتہ الکرسی کے آخیر درج ہے۔ اور سوہن لعل نے اس مسجد کے ملحق یا قرب میں کوئی عمارت باولی یا سکھوں کے گوردوارہ کے نام

بیان نہیں کی البتہ جو اس مسجد کے ساتھ سکھوں کے عہد میں سلوک ہوا اسے ہر دو سید لطیف اور کنہیا لعل نے اپنی اپنی تاریخوں میں درج کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"۔۔۔۔۔۔۔اس میں گرنتھ صاحب رکھا گیا تو باولی کے بھائی سکھ اور اکالیہ اس مسجد کے درپے ہو گئے اور مہاراجہ کی خدمت میں عرض کی کہ اس مسجد کا ملا بآواز بلند اذان دیتا ہے تو ہمارے کان میں پڑتی ہے یہ مسجد بھی باولی کے ساتھ ہمارے قبضہ میں رہنی چاہیئے یا گرا دی جائے کہ مسلمانوں کی ہمسائیگی گورو کے سکھوں کے ساتھ نہ چاہیئے مہاراجہ نے فی الفور حکم دیدیا کہ مسجد سے ملا نکال دیا جائے اس حکم کے صادر ہوتے ہی ملا بیچارہ نکال کر باہر کر دیا گیا اور مسجد میں اکالیوں نے قبضہ کر لیا اور تمام مسجد میں گوبر کا لیپ دے کر گرنتھ رکھ دیا گیا۔" مگر اس کی وضاحت کے لئے کسی قدر باولی کے متعلق بھی بیان کرنا لازمی ہے جو سنہری مسجد کے عقب میں ایک گوردوارہ ہے اس کے متعلق عام طور پر سکھ حضرات، لکھتے ہیں:۔

"گورو ارجن دیو جی کا بنایا ہوا گوردوارہ"

بیان کرتے ہیں جس کی ہمارے پاس کوئی مقامی یا کسی قریب کے زمانہ کی کوئی شہادت نہیں ہے۔ ہاں البتہ موخر زمانہ کے مورخین سید لطیف اور لالہ کنہیا لعل نے لکھا ہے کہ:۔

"یہ باولی گورو ارجن نے جہانگیر کے زمانہ میں بنوائی تھی اور اس کے ساتھ بہت بڑا لنگر خانہ ملحق تھا۔

اس کے بعد چونکہ گوردھر گوبند اور قاضی شہر کے درمیان جھگڑا ہو گیا اس وجہ سے اُسے سرکار نے اپنے قبضہ میں لے لیا اور لنگر خانہ کی بجائے ایک مسجد تعمیر ہو گئی جب ۱۸۳۲ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ بہت بیمار ہُوا تو نجومیوں نے اس باؤلی کو جاری کرنے کے لئے کہا اور اس کے پانی سے اشنان کرنے کے لئے تجویز کیا جس پر اس نے عمل کیا اور اُسے صحت ہو گئی اس نے فوراً لنگر خانہ کی جگہ کی مسجد کو گرا دیا اور پانچ سال کے عرصہ میں کمرے وغیرہ تعمیر کئے ایک حوض یا تالاب بھی تعمیر ہُوا جو باؤلی کے پانی سے بھر دیا جاتا اور اب خشک پڑا ہے۔ (راقم نے اُسے دیکھا ہے) اس کے کمروں کے مرکز میں گرنتھ صاحب رکھا گیا۔"

بقول کنہیا لعل وہ مسجد کاشی کاری سے مزین تھی جو لنگر خانہ کی جگہ تعمیر ہوئی تھی۔
مگر سوہن لعل سوری نے ۱۲۳۳ء (۱۸۷۵ء) کے تحت لکھا ہے۔

"سرکار عالی (مہاراجہ رنجیت سنگھ) از شالامار سوار شدہ از دہلی دروازہ بسواری فیل کوہ تمثیل از راہ مسجد طلائی و بازار ٹکسال و تھیار و باہڑ منڈی و لوہاری منڈی .... قلعہ لاہور گشتند"

اس سے ایک امر کا پتہ چلا کہ مسجد طلائی اُس وقت شہر میں ایک معروف عمارت تھی اور لاہور کا وہ حصہ جہاں آج خواجہ آیاز کا مقبرہ ہے جو پاکستان بننے سے پیشتر تک اسی تذکرہ ٹکسال کے نام سے بھی مشہور تھا لاہور کی یہ عام گذرگاہیں تھیں اور باولی کا وجود تک نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو سوہن لال سوری ضرور بیان کرتا کہ مہاراجہ نے یہاں قیام مقدس مقام کی وجہ سے کیا۔ بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ باولی صاحب گوردوارہ کا وجود زیادہ تر لجد کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے راقم کے سامنے اس وقت تواریخ گورو خالصہ ایک ضخیم تاریخی کتاب مولفہ بھائی گیان سنگھ گیانی ہے جس میں سمت ۱۸۹۰ کے واقعات میں مہاراجہ کا بیمار ہونا تو ضرور لکھا ہے اور اس کا ۵۱ تولہ سونے کی موت دان بھی لکھا ہے جو ایک برہمن کے ہاتھ میں دیدی گئی تھی۔ اور اس کا منہ کالا کر کے گھوڑے پر چڑھایا گیا تھا جس سے مہاراج کو صحت ہو گئی تھی غرضیکہ اس باولی کی طرف سکھ عمارت ظاہر کرنے کے لئے بہت سے بیان ملتے ہیں مگر معاصرانہ حیثیت سے کوئی شہادت نہیں ملتی۔

جب ہم اس باولی کے گرد نواح اور اس کی عمارت کی طرف ذرا توجہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سکھوں کو اس عمارت سے کوئی واسطہ نہیں ہے کیونکہ اس علاقہ میں سب سے قدیم اسلامی درگاہ خواجہ ایاز کی اسی جگہ کے قریب ہے پھر حویلی میاں خاں اور رنگ محل وغیرہ کی عمارات غرضیکہ راقم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس مسجد طلائی میں یعنی ان کی عبادت گاہ کی جد وجہد کو نگہداشت کے لئے سکھوں نے سیاسی طور پر یہ گوردوارہ قائم کیا جیساکہ

دیگر شاہی مساجد کے ساتھ گوردوارے قائم کئے ہوئے ملتے ہیں۔ اور اس طرح یہ بھی ایک ہے۔ کیونکہ مسجد ۱۷۵۳ء میں تعمیر ہوئی اور باولی کا وجود ۱۸۳۴ء میں ہوا۔ اگر ہم فنِ تعمیر کے اصولوں پر بھی ذرا باولی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا یہ عمارت خالص مغل عمارت ہے مگر بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک مکتب تھا جو سنہری مسجد کے ساتھ ہی تعمیر ہوا۔

مقبرہ جہانگیر

لاہور میں موضع شاہدرہ کو بہت اہمیت رہی ہے جو دراصل لاہور کا ایک طرح شاہی دروازہ تھا اسی طرح اسی نام پر ایک موضع دہلی کے باہر بھی ہے اور یہاں اوّل سرائے اکبر نے قائم کی جیسے تاریخ میں اس سے منسوب کیا گیا ہے یعنی یہاں سرائے تھی اور اس کے اندر جو سنگ سرخ کی مسجد ہے اسے ہم تاریخ داؤدی کے بیاں کے مطابق سلیم شاہ سوری کے عہد سے منسوب کرتے ہیں۔

بہرحال جب کشمیر کے راستہ میں جہانگیر کا انتقال ۱۰۳۷ء کو ہوا تو اسے لاہور میں لاکر یہیں سپردِ خاک اس سرائے کے ملحقہ باغ میں کیا گیا اور اس پر اس کے لڑکے شاہ جہاں نے نہایت شاندار روضہ تعمیر کیا جسکا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔

لالہ کنہیا لال لکھتا ہے کہ (سنہ ۳۲۴ھ) جب بادشاہ گردی ہوئی اور سکھ شاہی زمانہ آیا تو وہ سب سامان ایک دستبرش میں لوٹ لیا گیا عمارت باقی رہ گئی جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا زمانہ آیا تو مہاراجہ اس عمارت کی طرف متوجہ ہوا

اور حکم دیا کہ مقبرے کی منڈیروں پر جو ستون شمع جلانے کے اور جالیاں سنگ مرمر کی ہیں وہ اکھاڑ کر امرتسر لے جائیں اور سری دربار صاحب کے پل وغیرہ پر لگائی جائیں چنانچہ فی الفور حکم کی تعمیل ہوئی اور بیشمار پتھر اس مقبرے سے اکھڑوا کر امرتسر بھیجا گیا اور اس کی جگہ چونہ کی عمارت کر دی گئی اس کے بعد ارجن سنگھ پسر ہری سنگھ نلواری مقبرے میں فروکش رہا اس نے بھی پتھروں کے اکھڑوانے میں توجہ کی اور میناروں کے دہنوں کی بہت سی جالیاں سنگ مرمر وغیرہ کی کئی مقامات سے اس نے پتھر اکھڑوا لیے اور جب سردار سلطان محمد خاں برادر سردار دوست محمد خاں امیر کابل اپنے بھائی سے ناراض ہو کر لاہور آیا اور قصبہ شاہدرہ مہاراجہ نے اس کی جاگیر میں دیا تو وہ اس مقبرے میں چند سال سکونت پذیر رہا۔ اس کے لشکر کے وحشی افغانوں نے اس مقبرہ کا سخت نقصان کیا۔ اور بیشمار نگینے اندر کی دیواروں سے نکلوا لیے بہت سے پتھر توڑ ڈالے باغیچہ ویران کر دیا آخر سلطنت سکھی تک اس متبرک مکان کو صدمہ بر صدمہ پہنچتا رہا اور نقصان ہوتا رہا لاکھوں روپیہ کی جالیاں اور سلیں سنگ مرمر اور سنگ سرخ کی اتر گئیں جب صاحبان انگریز پنجاب فرمان فرما ہوئے تو گویا اسی مکان کی قسمت پلٹی انگریز آئندہ سے آج تک برابر اس کی مرمت کراتے رہے اور جب دریا نزدیک آگیا تو بنظرِ حفاظت پر کئی ہزار روپیہ خرچ کر کے بند بندھوایا جس سے یہ عالیشان مکان دریا کی غرقابی سے بچ گیا صرف کو گنی کی بیرونی دیوار دریا نے گرا کر شرقی دیوار کو بھی سخت صدمہ پہنچایا

مگر سید لطیف نے اس کی یہ بھی وضاحت کی ہے کہ اس عظیم الشان خوبصورت عمارت نے لہنا سنگھ جو لاہور کے تین حاکموں میں سے قبل عہد رنجیت سنگھ تھا اس کے ہاتھوں بہت ہی نقصان اٹھایا اور رنجیت سنگھ نے اپنے ایک فرانسیسی جرنیل موسیو مسے کو یہ روضہ رہائش کے لئے دیا ہوا تھا۔ جس کے بعد سلطان محمد کو اس میں رکھا گیا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

مقبرہ آصف خاں

مقبرہ جہانگیرؒ کی درمیانی سرائے کے مغرب کی طرف الگ ایک نہایت عظیم الشان بلند گنبد والا مقبرہ ہے اور یہ گنبد اپنی زبون حالی کی فریاد کرتا ہوا دور سے نظر آتا ہے۔ آصف خاں شاہجہان کا خسر اور نورجہاں کا بھائی تھا۔ بلکہ اسے جو دربار میں مرتبہ حاصل تھا اس وجہ سے اسے یمین الدولہ تاریخ میں لکھا ہے۔ اس کا لاہور میں ۱۰۵۰ھ میں انتقال ہوا تو اس کا مقبرہ شاہجہاں کے فرمان سے سرائے کے ملحق مغرب کی طرف تعمیر کیا گیا اور سرائے کو جلوخانہ لکھا ہے۔

متذکرہ بالا سطور میں ولیم مورکرافت کے الفاظ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس نے اس مقبرہ سے سنگ مرمر کی سلیں اتری ہوئی اور بیل گاڑیوں میں جاتی ہوئی دیکھی تھیں۔ چنانچہ جب ہم اس کے گنبد پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ایک سل بھی باقی نہیں ملتی ورنہ یہ سلیں اسی کی تھیں جسطرح بادشاہی مسجد کے گنبدوں پر لگی ہوتی ہیں۔

بقول لالہ کنہیا لال ۱۰۴۳ھ میں جس باغ کے وسط میں یہ مقبرہ بنایا گیا ہے۔ وہ باغ اتنا وسیع رکھا گیا کہ تین بیگہ زمین اس کے اندرون احاطہ تجویز ہوئی اس باغ کے متعلق اور بھی حافظ خانہ و مطبخ وغیرہ عمارتیں تھیں جو سب بطمع پتھر کے گرائی گئیں اس مقبرہ کا سامان چاندی سونے کی قندیلیں و جھاڑ فانوس و گرش و فراش مقبرہ جہانگیر سے کچھ ہی کم تھا جو سب کے سب تین حاکموں کے وقت غارت میں آیا درخت بھی کاٹ کر لوگ لے گئے تمام باغ کف دست میدان ہو گیا۔ مکانات و مقبرہ و چار دیواری باقی تھی وہ بسبب اپنے استحکام کے سکھوں کے ہاتھ سے محفوظ رہے آخر جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کو امرتسر بھیجنے کے واسطے پتھر کی ضرورت ہوئی اور نیز حضوری باغ میں بارہ دری سنگین بنانے کی تجویز ہوئی تو لاہور کے بہت سے مقبروں سے پتھر اتارا گیا جن میں اب بھی اکثر موجود ہیں اور اکثر بیخ و بنیاد سے کھدے گئے اور اکثر سرکار انگریزی کے وقت بصیغہ نزول نیلام ہو گئے اور خشت فروشوں نے ان کی اینٹیں نکال لیں چونکہ مقبرہ بہت بڑا تھا اور لاکھوں روپیہ کا پتھر اس پر نصب تھا مہاراجہ کے حکم سے اس کا پتھر اترنا شروع ہو گیا۔ اور اس بے احتیاطی سے پتھر اتارا گیا مقبرہ کھنڈر ہو گیا استحکام کا یہ حال کہ اب بھی دو ہزار برس تک کھڑا ہے تو عجیب نہیں سیڑھیوں کا پتھر اس بے رحمی سے نکالا ہے کہ سیڑھیاں منہدم کر دی ہیں مقبرہ کے اندر کا فرش سب اکھاڑ لیا گیا ہے چبوترہ منہدم کر دیا گیا ہے صرف قبر کا تعویز ایک ٹکڑا پتھر سنگ مرمر کا ہے اور آیات قرآنی و اسماء الٰہی اس پر کندہ ہیں یہ تعویز ہو بہو شکل تعویز قبر جہانگیر کے بنا

ہوا ہے وہی وضع وہی قطع وہی قد وہی قامت وہی تحریر وہی پتھر ہے۔

اس مقبرہ کے آٹھ درجی اور آٹھ دروازے ہیں ہر ایک دروازہ کی سنگی دہلیزیں ایسی بری طرح سے نکالی ہیں کہ دروازے سے بالکل منہدم ہو گئے ہیں غرض کہ اس مقبرہ کی حالت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بنانے والوں نے تو لاکھوں روپیہ خرچ کرکے ان عمارات کو بنایا اور گرانے والوں نے صرف پتھر کی طمع سے بے رحم ہو کر اس کو گرا دیا اور زمانہ کے انقلاب نے وہ صورت دکھلائی کہ دن کی جگہ اندھیری رات ہو گئی۔ محاذ مقبرہ کی مغربی دیوار کے ساتھ ایک پختہ مسجد بنی ہوئی ہے جس کی ہیت بدل کر اب کسی صاحب ریلوے کے ملازم نے کوٹھی بنائی ہے۔"

راقم نے اس مقبرہ کو ۱۹۰۵ء میں دیکھا تھا جبکہ اس کا تعویز جنوبی درجی میں پڑا تھا اور تمام چبوترہ کے حصہ کے گرد کانٹے دار لوہے کی تار لگی ہوئی رکھی اندر جانے کا ایک راستہ بھی نہ تھا بے شمار مٹی تھی۔

مقبرہ نور جہاں

یہ مقبرہ نور جہاں ریلوے لائن کے شمال کی طرف واقع ہے۔ اس مقبرہ کو نور جہاں نے خود اپنی زندگی میں ہی بنوا لیا تھا جب اس کا انتقال ۱۰۵۵ھ میں ہوا تو اسے یہیں دفن کیا گیا لالہ کنہیا لال اس کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ مکان شاہ جہانی عہد میں نہایت مکلف و سنگین بنایا گیا تھا اندر کا چبوترہ اور دونوں قبریں سنگ مرمر کی تھیں اور باہر کی دیواروں پر سنگِ سرخ تھا فرش،

سنگ ابری کا تھا۔ اس کے بھائی آصف خاں کے مقبرہ کا پتھر اترا تو وہی آفت اس کے مقبرہ پر آئی سب پتھر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے اتار دیا گیا۔

راقم نے جب اُسے ۱۹۰۹ء میں دیکھا تو اس وقت یہاں ایک بہت برگزیدہ درویش رہتا تھا جو بظاہر پٹھان معلوم ہوتا تھا لوگ اس کی ہیبت ناک شکل و صورت کی وجہ سے قریب نہیں جاتے تھے اور بہت ہی ڈرتے تھے۔ آخر اس کا انتقال یہیں ہوا اور اُسے آصف جاہ کے مقبرہ کے اندر شمالی دیوار کے ساتھ دفن کیا گیا تھا۔

مگر عبرت کا مقام ہے کہ آخر ۱۹۲۲ء میں دہلی کے رئیس حکیم اجمل خاں مرحوم نے اس کی کماحقہ مرمت کروا دی اور خود تمام اخراجات برداشت کئے جیسا کہ وہاں ایک نصب شدہ مرمری سل سے بھی واضح ہے۔

جو اس گورنمنٹ کو کرنا چاہیئے تھا۔ اس سے پیشتر اس کا درمیانی حصہ خاصہ بلند تھا اور مشرق کی طرف معمولی سے خط میں یہ شعر بھی تھا ؎

بر مزار ما غریبان نے چراغے نے گلے

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ متذکرہ بالا وہ آثار سلف ہیں جن پر لاہور کی رونق اور عہدِ مغلیہ کی ثقافت و تاریخ وابستہ ہے غیر ممالک سے جو مہمان پاکستان آتے ہیں گورنمنٹ کی طرف سے ان عمارتوں یعنی شالامار باغ۔ مقبرہ جہانگیر۔ نور جہاں۔ بادشاہی مسجد وغیرہ کو دیکھنے کا پروگرام ہوتا ہے یہ خدا ہی جانتا ہے کہ ہماری گورنمنٹ کہاں تک اپنے فریضہ سے عہدہ برآ ہوتی ہے افسوس تو اس امر کا ہے کہ سکھوں نے اس امر کا خیال نہ کیا

کہ آخر یہ عمارتیں ملک و قوم کی امانت ہیں اور مہمانوں کے لئے اُن کا دیکھنا باعث افتخار ہے۔

اگر نہایت احتیاط سے مقبرہ نور جہاں سے لے کر بارہ دری مرزا کامران تک جو اس وقت بد قسمتی سے بالکل تباہ ہو کر دریا میں کسی نہ کسی طرح کر دی گئی ہے ایک سروے کی جائے تو لاہور کی بہترین عمارات کے نشان آج بھی کھودنے سے ملینگے میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک مرتبہ جب بارش اور طغیانی راوی نے یہاں کی زمین کو تہ و بالا کیا تو کئی عمارت تو جو زیادہ تر بصورت باغات تھیں ان کے آثار نمودار ہو گئے تھے اور ان کی رپورٹ ایک طرح اخبار میں بھی آگئی تھی جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ وہ قلعہ لاہور سے راوی دریا میں بذریعہ کشتی سوار ہو کر دوسرے کنارے پر گیا اور وہاں سے ایک موضع جیپال میں گیا جہاں اس کی والدہ رہتی تھی لکھتا ہے کہ میں ملنے کی سعادت حاصل کر کے پھر یہیں واپس آگیا۔ آج ایک موضع قریب تین چار میل مغرب کی طرف دریا سے دور بنام بیگم کوٹ ہے ممکن ہے یہ گاؤں دراصل جیپال اسی زمانہ سے تھا مخض جہانگیر کی والدہ کی وجہ سے بعد میں بیگم پورہ کہلاتا ہو کیونکہ لاہور میں جو شاہی مسجد اندرون مستی دروازہ ہے وہ بھی جہانگیر نے اپنی والدہ کے لئے بنوائی ہوئی ہے جسے ہم نے یہاں بیان کر دیا ہے اور وہ اسی وجہ سے بیگم شاہی مسجد کہلاتی ہے۔

باغ مرزا کامران و بارہ دری

ظہیر الدین بابر بادشاہ نے اپنے لڑکے مرزا کامران کو لاہور کا گورنر مقرر کیا

جس نے لاہور میں آتے ہی اپنے باپ کے نقش قدم پر لاہور میں ایک باغ راوی کے کنارے تیار کیا جسطرح اس کے باپ نے دریائے جمنا کے کنارے آگرہ میں بنایا تھا۔ اور بابر جب پہلی مرتبہ لاہور آیا تو اس نے اسی باغ میں قیام کیا اس باغ میں مرزا کامران نے جو عمارتیں بنائی تھیں ان میں سے ایک بارہ دری بالکل دریا راوی کے کنارے پر تھی جسے ہم نہایت وثوق سے مغل عہد کی اول عمارت کہہ سکتے ہیں مگر بدقسمتی سے آج ہم اس سے بھی محروم ہو چکے ہیں کیونکہ ایک تو دریا راوی کے وقتاً فوقتاً طغیانی نے اُسے نقصان پونچایا کیونکہ اس کی حفاظت کا کوئی کماحقہ انتظام نہیں کیا گیا خاص کر پاکستان بننے کے بعد اس سے بالکل بے اعتنائی برتی گئی حتیٰ کہ اس بارہ دری کو بالکل دریا راوی میں ڈال دیا گیا یعنی دریا کو اس بارہ دری کے پیچھے سے گذرنے کا انتظام کرایا حالانکہ ہمیشہ اس مقام پر بیڑیوں کا پل رہا ہے اور یہ بارہ دری نہایت محفوظ چلی آئی تھی۔ جس طرح سید لطیف نے اپنی تاریخ لاہور میں (ص ۱۱۲) اس کی پوری تصویر دی ہے اور لالہ کنہیا لال نے لکھا ہے کہ اب پچاس ساٹھ سال سے دریا میانہ بارہ دری کے نیچے بہتا ہے مگر بارہ دری اسی طرح قایم ہے یہ کہنہ عمارت محراب دار دہنوں کی بنی ہوئی ہے۔ یعنی سکھوں کے عہد میں بھی یہ عمارت قائم تھی چونکہ یہ خالصاً چونہ گچ خشت کی تعمیر ہوئی تھی اس لئے سکھوں سے محفوظ رہی البتہ دیگر عمارتیں جو اس باغ کے درمیان اور نورجہاں کے مقبرہ کے درمیان تھیں وہ بھی تباہ ہو گئیں۔

مسجد طبی بازار حکیماں

یہ مسجد آج مدرسہ نعمانیہ سے ملحق جنوب کی طرف برسر بازار واقع ہے اور یہ مسجد اپنی فنی خوبیوں کے اعتبار سے واقعی عہدِ شاہجہانی کی بہت بڑی نشانی ہے۔ بقول سید لطیف اس مسجد کے ماتھے پر ایک کتبہ بھی تھا۔ جس سے واضح تھا۔ کہ اسے غلام مہدی خاں نے بعہدِ شاہی تعمیر کیا تھا۔ مگر سکھوں کے عہد میں اس میں بارود بھری رہتی تھی۔ ابتدا عملداری انگریزی میں چند سال یہ غیر آباد رہی۔ آخر مولوی غلام قادر صاحب مرحوم نے سرکار میں درخواست کر کے اس مسجد کو آباد کرنے کا حکم حاصل کیا۔ اور امام بخش قصاب نے جس کے پاس ٹھیکہ گوشت رسانی تھا اس نے اس کو دوبارہ آباد کیا۔ اس کی تعمیری خوبیوں کے متعلق الگ لکھا گیا ہے۔

علاقہ سبز گنبد

یہ متوسط حجم کا مکعب مقبرہ لاہور میں ٹکسالی دروازہ کے اندر بازار شیخوپوریاں سے آتے ہوئے جنوبی رویہ مکانوں کے پیچھے واقع ہے۔ اور تحصیل کی دیوار جو آج تھانہ ٹبی کہلاتا ہے بالکل ملحق ہے اور یہ مزار عام طور پر سبز گنبد۔ یا مزار پیر سبز کے نام سے مشہور ہے۔ فن تعمیر اور تعمیری زیب و زینت اور نقش و نگار کے اعتبار سے یہ روضہ کبھی عجائبات روزگار میں شمار ہوتا تھا۔ جس کی مفصل تعمیری کیفیت الگ درج کی گئی ہے۔ مگر زمانہ کی نیرنگیاں ملاحظہ ہوں۔

کہ آج لاہور کا یہ حصّہ بہت ناشائستہ شمار ہوتا ہے کیونکہ یہاں آج طوائفیں رہتی ہیں۔ صاحب روضہ کا نام مؤرخین لاہور نے سیّد بدالدین شاہ عالم " بخاری لکھا ہے۔ جن کا انتقال بعہد شاہ جہان ہُوا۔ نواب سعد اللہ نے اسے تعمیر کیا تھا۔ اس روضہ کے ساتھ بہت وسیع باغ وکنواں تھا۔ جن کے نشان ہنوز باقی تھے۔ اور اس کا بہت سا حصہ توعصیل میں شامل کیا گیا۔ اور جب راجہ سوجیت سنگھ نے لاہور میں اپنی حویلی تعمیر کی۔ تو اس نے اس روضہ کا بے شمار حصّہ اپنی حویلی میں شامل کرلیا۔ جس وجہ سے یہ تمام مقام بے رونق ہوگیا۔ بقول شخصے غنیمت ہے کہ گرنے سے روضہ بچ گیا۔ سیّد لطیف نے بیان کیا ہے لاہور کے خاندان سادات بخاری اس روضہ کی نگہداشت کرتے ہیں۔ اور یہ باغ بہت ہی وسیع تھا۔

محمد غوثی نے اپنی تالیف اذکار ابرار در فارسی گلشن ابرار میں مولانا حسام الدین سبز وحسام الدین شرح کا ذکر کیا ہے۔ جو شہر لاہور میں اکبر کے زمانہ میں سکونت، رکھتے تھے اور خواجہ نقشبند کی خدمت میں ارادت رکھتے تھے۔ اور علوم و فنون میں ملکہ رکھتے تھے۔ ان کا انتقال ۹۷۰ھ میں ہوا۔ اور ان کی خوابگاہ لاہور میں ہے۔ ممکن ہے۔ لقب " سبز " کی وجہ سے ان میں سے ایک بزرگ کا مزار یہی سبز گنبد والا بنایا گیا ہو۔ جو واقعی فنی اور عام تعمیری خوبیوں کے اعتبار سے عہد اکبر سے تعلق رکھتا ہے۔ بالخصوص جب ہم اس سبز گنبد کا مقابلہ نیلے گنبد کی کاشی کاری سے کرتے ہیں۔ تو یہی یقین کرنا پڑتا ہے۔ افسوس اس سبز گنبد کی تمام سبز کاشی کاری آج مفقود ہو چکی ہے جسے راقم نے کبھی مشاہدہ کیا تھا

مصالح کی پچی کاری میں عربی نسخی کتبات و دیگر فنی شواہد اسی ابتدائی مغل عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی رہا حسام الدین سُرخ کا مقبرہ لاہور میں کچھ علم نہیں کہاں ہے۔ ممکن ہے اس کی طرف بھی آج کوئی اور نام منسوب ہوتا ہو۔ اور مورخین لاہور نے جو نام بدرالدین شاہ عالم بخاری لکھا ہے اس نام سے بھی کوئی اور بزرگ اس علاقہ میں مدفون ہوا ہو۔ اور آپ کے خلفاء وغیرہ میں سے ہو۔

شاہ شرف (اشرف)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد کے واقعات جو ۱۸۱۲ء۔ ۱۸۱۸ء میں رونما ہوئے زیادہ تر افغانان کابل سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ فتح خاں وزیر شاہ محمود کابل نے ایک اہم کشمیر لے گورنر عطا محمد اور اٹک کے گورنر سردار جہاں داد کی یاداش میں اختیار کی کیونکہ انھوں نے شجاع الملک کو امداد دی تھی جو چاہتا تھا کہ پشاور حاصل کر کے کابل کی حکومت کو ہاتھ میں لے لے۔ اسی اثناء میں فقیر عزیزالدین رضا کو فوج دے کر اٹک کی طرف ارسال کیا اور جہانداد خاں گورنر اٹک کو وزیر آباد بھیج دیا گیا مگر اُسے از روئے مصلحت وزیر آباد پہنچنے پر لاہور طلب کیا گیا۔ جب وہ لاہور پہنچا تو اُسے بقول سوہن لال سوری صاحب، عمدۃ التواریخ :۔

"........ متصل مسجد شیخ اشرف بیرون بھاٹی دروازہ قیام پذیر گردانیدہ۔ روز دوم بر ملاقات بہجت آیات سرکاری مع دو راس اسپ مسرور گردانیدند (۲/۱ ۱۸۱) یعنی لاہور میں بھاٹی دروازہ کے باہر متصل مسجد

شیخ اشرف جہانداد خاں نے قیام کیا۔ بقول مورخین لاہور ۱۸۸۴ء تک بھاٹی دروازہ کے باہر ضلع لاہور کی کچہری سے لے کر برف خانہ تک یعنے جہاں آج وکٹوریہ ہاسپٹل ہے جو آبادی تھی وہ محلہ شاہ شرف کہلاتا تھا اور آپ نے ہی اُسے آباد کیا تھا اور یہ محلہ اپنے زمانہ میں نہایت ترقی پر تھا۔

سید شاہ شرف کے متعلق سید محمد لطیف نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ آپ بہت بڑے فاضل تھے اور آپ کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا آپ نے اورنگزیب کے عہد میں ۱۱۱۰ھ میں انتقال کیا آپ کا عالیشان اور بہت خوبصورت مقبرہ ٹکسالی دروازہ کے باہر سامنے گوروں کے قبرستان کے شمال کی طرف بنایا گیا تھا آپ کا روضہ اور اس کے ساتھ آپ کی مسجد ہر دو عمارتیں بہت اعلےٰ پایہ کی فنِ تعمیر کے لحاظ سے تھیں جن بزرگ لوگوں نے ان عمارات کو دیکھا ہے نہایت وثوق سے اپنی یادداشت کو بیان کرتے ہیں کہ شان و شوکت۔ مذاقِ فنِ تعمیر کے اعتبار سے وہ نہایت عمدہ اور کامل عمارات تھیں۔ ان کی دیواریں اندر سے مرمر کی سلوں سے آراستہ تھیں اور باہر سرخ پتھر لگا ہوا تھا اور کاشی کاری سے مرصع تھیں۔

جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا زمانہ آیا اور شہر کے گرداگرد پختہ خندق بننے لگی اور دوہرے دروازے بنوائے گئے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ بھاٹی دروازہ کے باہر کے دروازے کے آگے کھلا ہوا میدان ہو اس لئے وہ رنگین مسجد اور مقبرہ دونوں گروا دیئے گئے بڑی مشکل سے یہ عمارت گری اور شاہ شرف کی لاش کا صندوق نکلوا کر فقیر عزیزالدین کی معرفت احاطہ مزار حاجی

محمد سعید کے شمال میں بمقام دولا واڑی دفنایا گیا اور مہاراجہ کے حکم سے چھوٹا سا چبوترہ پختہ اس پر بنا دیا گیا جو اب تک موجود ہے اس مسجد و مقبرہ کی بنیادیں اب بھی بھاٹی دروازہ کے باہر کے میدان میں نظر آتی ہے (تاریخ لاہور کنہیالال ص۲۸۵) بلکہ سید لطیف نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ان عمارات کے قیمتی پتھر سکھوں کے دربار صاحب کو زینت دینے کے لئے امرتسر ارسال کر دیئے گئے۔

مفتی تاج الدین نے اسی زمانہ (۱۸۶۷ء) میں یوں بیان کیا ہے محلہ شیخ اشرف۔ بھاٹی دروازہ سے بغایت موقع بنائے دار العدالت ضلع۔ شیخ اشرف عہد عالمگیر میں بڑا بھاری عامل تھا۔ بیرون بھاٹی دروازہ اس نے مسجد عالیشان اور مکانات سکنی بنوائے اس لئے اس بستی کا نام محلہ شیخ اشرف مشہور ہوا جب وہ مر گیا تو قبر اس کی اسی جگہ ہوئی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے وقت تعمیر خندق کے اس مسجد و دیگر عمارات شیخ کو بارود سے اڑا دیا اور نعش اس جگہ سے نکال کر میانی میں دفنائی گئی۔

متذکرہ بالا بیان متعلقہ سید شاہ شرف کچھ وضاحت کا محتاج ہے۔ کیونکہ عمدۃ التواریخ وغیرہ میں آپ کا نام شیخ اشرف لکھا ہے اور مفتی غلام سرور نے اپنی تالیف خزینۃ الاصفیا میں "شاہ شرف لاہوری (۱۹۶/۱) کے تحت لکھا ہے کہ آپ کا وطنی حصہ بٹالہ تھا آپ کے بزرگ قوم کھتری سے تھے آپ نے لاہور میں بٹالہ سے آ کر سکونت اختیار کی اور آپ نے بخدمت شیخ محمد فاضل قادری حاضر ہو کر بیعت کی اور آپ کو خطاب شاہ شرف عطا

عطا ہوا۔ آپ کی وفات ۱۱۳۵ھ میں ہوئی اور آپ کا مزار پُر نور لاہور میں ہے نور احمد چشتی نے اپنی تالیف تحقیقاتِ چشتی میں شاہ شرف کا ذکر دو مقام صفحہ ۱۹۶ صفحہ ۵۹۸ پر کیا ہے جو کسی قدر خزینۃ الاصفیا کے بیان کی مطابقت کرتا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت شاہ شرف کی خانقاہ جاتے ہوئے دہنی طرف سڑک جیل متصل ٹیلہ ہائے چاند ماری موجود ہے۔ یہ مزار ایک چبوترہ خشتی پر واقع ہے اور اس چبوترہ پر تین قبریں ہیں ایک حضرت شاہ شرف اور دوسرے ان کے مرشد محمد فاضل صاحب اور تیسرے ان کے مرید عزیز اللہ کی ہے۔"

پھر آگے چل کر چشتی صاحب مرحوم نے شیخ امیر بخش سجادہ نشین حضرت شاہ جمال مرحوم کی زبانی جو بیان کیا ہے وہ قریب قریب وہی ہے جو خزینۃ الاصفیا سے درج ہو چکا ہے۔

متذکرہ بالا بیانات میں سید شاہ شرف کے متعلق تمام اقتباسات دے دیئے گئے ہیں۔ اور جس طرح سید لطیف اور کنہیا لال دونوں نے ان کی عمارات بیرون بھاٹی ٹکسالی دروازہ کو بہت اعلیٰ فنِ تعمیر کا شاہکار بیان کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارات ضرور اسی زمانہ سے قبل تعمیر ہوئی تھیں جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں کیونکہ فنون کی سرپرستی اور معیار فن کے اعتبار سے زمانہ مابعد اورنگ زیب زیادہ انحطاط میں آچکا تھا اور اس کے علاوہ بعض نے آپ کے نام کو شرف یا اشرف سے بھی بیان کیا ہے جو مزید تلاش کا متقاضی ہو جاتا ہے اور مزید برآں.............

آپ یہاں کے بزرگوں میں بھی شامل تھے اور یہی علاقہ بیرونِ بھاٹی دروازہ بوجہ مرقد مبارک حضرت ہجویری زیادہ تر بزرگانِ دین سے آباد ہو چکا تھا اور جیسا کہ شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی تالیف سفینۃ الاولیا میں اس کی صراحت کی ہے اور اس طرح آپ نے اپنی دوسری تالیف سکینۃ الاولیا میں حضرت میاں میر صاحب کے مریدوں میں ایک "سید اشرف" کا ذکر یوں کیا ہے۔

دیگر زاہدوں کے سردار عابدوں کی سند سے سید اشرف صحیح النسب سادات سے ہیں آپ حضرت میاں جیو علیہ الرحمۃ کے مرید تھے بخدمت اور بیداری کے سبب بہت کمزور ہو گئے تھے، اور آخر میں حضرت میاں جیو کبھی کبھی آپ کو اپنی خدمت میں بیٹھا چھوڑتے ایک روز بادشاہ سلامت حضرت میاں جیو علیہ رحمتہ کی کی خدمت میں گئے اس وقت تمام اصحاب میں سے فقط سید اشرف ہی حاضر خدمت تھے میں اکثر آپ کے ہم صحبت رہا ہوں۔ آپ ہفتہ کے روز ۱۴ ذی قعدہ ۱۰۶۲ھ کو فوت ہوئے ......"

(اردو ترجمہ سکینۃ الاولیا صـ ۱۷۱)

راقم کا ذاتی خیال ہے کہ حسن آب و تاب سے سید شاہ شرف یا اشرف کے مزار اور مسجد کا ذکر سید لطیف اور کنہیا لعل نے بیرون بھاٹی دروازہ بیان کیا ہے وہ یہی سید اشرف ہیں جن کا ذکر سکینۃ الاولیا میں ملتا ہے اور انہی کی یاد میں لاہور میں ان کے روضہ اور مسجد کو شاہی عمارات کی روایات کے مطابق مرمری عمارات تعمیر کی گئیں تھیں اور یہی نام عمدۃ التواریخ میں اور مفتی تاج الدین کے ہاں بھی ملتا ہے اور شاہ شرف الگ ہیں جیسا کہ اوپر تحقیقات چشتی خزینۃ الاولیا کی سند سے بیان

ہو چکا ہے جن کا مزار جیل روڈ پر ہے۔

حاجی سعید

غرضیکہ یہ بات مسلم ہے کہ رنجیت سنگھ نے شہر کی خندق بناتے وقت ان عمارات کو گرو ا کر ان کے مصالح کو اپنی عمارات امرتسر اور لاہور پر استعمال کیا اور شہر کے مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے آپ کی لاش کو میانی یا دو لاواری محلہ حصہ شہر آج نیلا گنبد کے نام سے موسوم ہے اس میں دفن کر دیا جو بذاتِ خود شاہی زمانہ کی مشہور عمارات اور بزرگانِ دین وفضلا کے زمانہ سے زیادہ آباد تھا۔

لالہ کنہیا لال نے ایک محلہ لاہور در لاواڑی" کے نام سے یوں بیان کیا ہے۔ کہ یہ محلہ بھی لاہور کے نامی گرامی محلوں میں سے ہے۔ مسمی دولا زمیندار کوٹ داڑی نے اس کو آباد کیا تھا۔ سید عبدالرزاق کی جو ایک بزرگ سید موج دریا بخاری کے خلیفوں میں سے تھا سب سے اول یہاں آکر سکونت پذیر ہوا ساور رونق آبادی کی بڑھ گئی۔ آخیر سلطنت چغتائی تک اس کی آبادی پھر سے اوج پر آئی۔ اسی سبب سے کہ خانقاہ عبدالرزاق کی میں کوئی نہ کوئی بزرگ ایسا قیام پذیر رہتا جس سے تمام زمانہ کو فیض پہنچتا تھا۔ بدعملی کے وقت یہی محلہ غارت سے بچا رہا۔ ایک بزرگ حاجی محمد سعید نام اسی میں رہتا تھا۔ سکھ بھی اس کا لحاظ کرتے تھے جب احمد شاہ درانی بعد فتح مرہٹہ لاہور آیا تو حاجی محمد سعید کی زیارت کو حاضر ہوا۔ اور شاہی پہرہ محلہ میں اس واسطے مقرر کر دیا کہ کوئی غارت گر کسی محلہ

پرست انداز نہ ہو۔ آخر جب محمد سعید مر گیا تو گوجر سنگھ کی نسل بنے اس محلہ کو لوٹ کر بے چراغ کر دیا۔ اس وقت کی عمارات میں سے ایک تو روضہ پختہ و مسجد جو سید عبدالرزاق کی موجود ہے۔ جس کو بازار انارکلی میں نیلہ گنبد کہتے ہیں۔ اور ایک پختہ مسجد جو سید عبدالرزاق کے احاطہ کے اندر تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت مقبرہ اور مسجد میں بارود بھری رہتی تھی۔ اور مسجد کے صحن میں لوہار آہنی گولے بناتے تھے۔ انگریزوں کے وقت مقبرہ اور مسجد خالی ہوا۔ اور میکوٹ بنا دیا گیا۔ چند سال صاحبان انگریز ان میں کھانا کھاتے رہے۔ جب انارکلی سے چھاؤنی فوج میاں میر چلے گئے تو مسجد و مقبرہ منشی نجم الدین ٹھیکہ دار گوشت نے سرکار سے لے لیا۔ مسجد کو اس نے از سر نو مرمت کر کے آباد کر دیا۔ مقبرہ میں بھی قبر بنا دی گئی۔ تیسرا احاطہ مزار حاجی محمد سعید اب تک موجود ہے۔ جس میں حاجی ممدوح کی قبر ہے۔ یہ احاطہ بہت بڑا ہے۔ اور دروازہ آمد و رفت مغرب کی سمت ہے۔"

آج لاہور میں ان قدیم محلوں کا صحیح مقام بھی تعین کرنا کوئی آسان امر نہیں ہے۔ بہر حال مفتی تاج الدین مرحوم نے لکھا ہے "محلہ ملا قاری گوشہ شمال مغرب محلہ پیر مزنگ کے تھا جس موقع پر مقبرہ سید چراغ بخاری کا ہے وسط محلہ تھا۔ یعنی آج جہاں ہائی کورٹ و اکونٹنٹ جنرل کا دفتر ہے اور موجودہ مزنگ اڈے کے شمال مشرق کی طرف جو علاقہ ہے اور اس مقام پر سید اشرف کی نعش کو لا کر بطرف جنوب مقبرہ شاہ چراغ رح جہاں ۱۸۶۷ء میں بقول چشتی نور احمد کوٹھی کپتان ہال صاحب ڈپٹی کمشنر ضلع لاہور میں تھی اور یہ چار دیواری مزار حاجی سعید

کی تھی اور ان کو عوام عبداللہ داڑھی بزرگ کہتے تھے۔ آپ کے مزار اور حالات ضمن میں راقم نے کافی حوالے تلاش کیے گر لاہور میں آپ کے مزار کو پوری طرح تعین نہیں کر سکا۔ حسن اتفاق سے جستجو نے آخر اسی نیلا گنبد کے علاقہ میں جسے بینک سکوائر کہتے ہیں اور جہاں امریکی ادارہ اطلاعات ہے اسی علاقہ میں شمال کی طرف سڑک عبور کر کے ایک مسجد اور تکیہ نما سا احاطہ ہے، اس میں چند قبور ہیں جہاں آپ کی قبر ہے جس پر لوح مزار بصورت سل سنگ مرمر ہے۔ اور اتفاق سے اس سل پر ذیل کا کتبہ کندہ ہے مگر اس میں جو تاریخ درج ہے وہ سنہ ۱۱۸۰ھ ہے۔ نہ معلوم یہ کیوں غلط ہے مگر یہ سل میرے نزدیک بعد کی ہے اور سید لطیف نے بھی اپنی تاریخ لاہور میں آپ کے مزار کے متعلق لکھا ہے:۔

مزار

حضرت خواجہ حاجی محمد سعید لاہور

سنہ ۱۱۸۱ھ

احمد سعید آں سعید زماں
کہ بیروں ست وصفش گفت وشنید
بتاریخ سرخیل آں شیخ دیں
ندا شد زول شیخ واصل سعید

اسی طرح احاطہ میں آپ کے علاوہ حضرت شیخ اشرف رح، مزار حاجی عبدالرحمن و مزار حاجی عباداللہ بھی ہیں یعنی ان میں شیخ اشرف کی بھی قبر ہے جسے

رنجیت سنگھ نے بیرون بھاٹی دروازہ سے نکلوا کر اور جگہ دفن کر دیا گیا۔ ویسے محمد فوق مرحوم نے بھی اپنی تالیف ملا عبدالحکیم سیالکوٹی میں مذکورہ بالا واقع وغیرہ درج کیا ہے مگر حوالہ نہیں دیا۔

عام طور پر مؤرخین لاہور نے حاجی محمد سعید کی وفات کو ۱۱۸۱ھ میں لکھا ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ بزرگ اس سے بہت قبل زمانہ میں ہوئے ہیں کیونکہ ان کا ذکر اس عہد کی کتب میں تو ملتا نہیں البتہ مراۃ العالم (۱۰۷۸ھ) بختاور خاں میں حاجی محمد سعید کا ذکر نہایت وضاحت سے ملتا ہے کہ "آپ فاضل مدقق، متورع تھے اور آپ کا مشرب فقر تھا اور نہایت مختصر لباس ایک معمولی سی دستار اور دو چادریں رکھتے تھے۔ کبھی درویشوں کی طرح انہیں اوڑھ لیتے تھے۔ آپ ہمیشہ کسب حلال سے روزی کھاتے تھے بلکہ باپ کے گھر سے بھی نہیں کھاتے تھے آپ ادائے مناسک حج کیلئے حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے اور وطن واپس آئے تو درس دیتے رہے شاہجہان نے ہر چند آپ کو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور نواب سعد اللہ خاں کو بھیج کر طلب فرمایا مگر آپ نے ملازمت قبول نہیں کی۔ آپ نے بیضاوی پر حاشیہ بھی لکھا ہے چونکہ آپ کو بالاتفاق تمام مورخین لاہور نے "حاجی محمد سعید" کے نام سے لکھا ہے اور پھر اسی احاطہ میں آپ کی قبر کا تعین کیا ہے اس لئے میرے نزدیک حاجی محمد سعید ہی مراد ہیں جن کا ذکر مراۃ عالم میں ان شاندار الفاظ میں ملتا ہے بلکہ مفتی تاج الدین کے قول کے متعلق سید اشرف کی نعش کو جو بھاٹی دروازہ سے نکال میانی میں دفن کر دیا تو اس سے بھی یہی حاجی محمد سعید کا ہی احاطہ مراد ہے کیونکہ میانی کا قبرستان بھی کئی میلوں پر اس مقام تک اس زمانہ میں پھیلا ہوا تھا۔

جہاں آرا بیگم صاحب نے اپنے رسالہ "صاحبیہ" میں حضرت ملاشاہ کی نماز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کبھی قضا نہیں ہوئی جس میں ایک ملا محمد سعید کا ذکر کیا ہے کہ وہ امامت کے فرائض انجام دیتے اور کسی دوسرے کو موقع نہ دیتے اور یہی آپ کے عقیدتمند اور ممتاز مریدوں میں تھے۔
جنکا وطن استاق بدخشان تھا جو حضرت ملاشاہ سے نسبت رکھتے تھے۔
ایسے مریدوں کی شان میں آپ کی ایک رباعی ملی ہے ۔

اے تافتہ بر روی تو نوری زالہ
زاں نور برد ئے ہمہ یکشائی راہ
یاراں تو اولیائے وقت اند ہمہ
نازم بتو شاہ اولیاء ملا شاہ

(راز اورینٹیل کالج سنہ ۱۹۳۷ء اگست)

ہم نے متذکرہ بالا اقتباس کنہیا لعل میں جو روضہ عبدالرزاق اور آپ کی مسجد کا ذکر کیا ہے اس سے مراد موجودہ نیلہ گنبد چوک کی قدیم مسجد مراد ہے۔ چونکہ آج سے تقریباً ایک صدی پیشتر جب یہ کتابیں لاہور پر لکھی گئی تھیں تو اس وقت سکھوں کے خاتمہ اور انگریزوں کی ابتداکی وجہ سے لاہور میں اتنی آبادی نہیں تھی اور یہ روضے اور ان کے ساتھ ان کے احاطے لاہور کے بہت مشہور محلے تھے بلکہ یہ حصہ تو بالخصوص اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ احاطہ سید موج دریا، احاطہ حاجی محمد سعید علاقہ شاہ چراغ اور نیلہ گنبد" ایک دوسرے سے بالکل ملحق تھے ، اس وجہ سے بعض اوقات انکی تحریروں سے کسی قدر التباس سا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال نیلہ گنبد کے متعلق ذیل میں مختصر کیفیت فن تعمیر

کے اعتبار سے پیش کی جاتی ہے۔ (اگرچہ کسی قدر موضوع کے اعتبار سے ہم دور ہو جاتے ہیں)

نیلہ گنبد

اس وقت لاہور میں یہ حصہ لاہور جو آج نیلہ گنبد کے نام سے مشہور ہے بہت ہی پُر رونق ہے اور یہاں کافی گہما گہمی رہتی ہے، یہ ایک مزار ہے جس پر بہت بڑا گنبد ہے اور اسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس پر گہرے فیروزی رنگ کی کاشی کاری کی ہوئی ہے اگرچہ یہ کاشی کاری اب آہستہ آہستہ مرور ایام اور بے توجہی کے باعث ضائع ہو رہی ہے مگر اسی فیروزی رنگ گنبد کی وجہ سے عام زبان زد "نیلہ گنبد" ہے یہ گنبد بہت بڑا ہے دور سے نظر آتا ہے اور کافی بلند ہے اگرچہ کسی قدر دوسری عمارتوں میں دب سا گیا ہے یہ تمام عمارت خشتی ہے اور مثمن پلین (سطح) پر قائم ہے لاہور میں اس وقت ایسی عمارتیں اور بھی ہیں جو مثمن سطح پر قائم ہیں مثلاً روضہ آصف خاں شاہدرہ میں اور روضہ علمردار خاں ریلوے ورکشاپ میں جو حسن اتفاق سے سطحی پیمائشوں کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر ہیں بلکہ ان کا پلین بھی قریب قریب ایک ہی ہے اور یہ عمارتیں کسی قدر بمقابلہ نیلہ گنبد کی عمارات زیادہ نازک اور چھوٹی معلوم ہوتی ہیں چونکہ ان کے بیرونی دیواروں سے رنجیت سنگھ کے زمانہ میں تمام پتھر نوچ لیا گیا اس لئے ہم ان کا ذہنی اعتبار سے کماحقہ اندازہ لگانے سے قاصر ہیں مگر جب ان کا نیلہ گنبد سے مقابلہ کرتے ہیں تو واضح طور پر نیلہ گنبد کی عمارت ان ہر دو عمارات سے قبل کے عہد کی معلوم ہوتی ہے۔ اول تو یہ خالصتاً خشتی ہے کیونکہ ابتدائی زمانہ میں پتھر

اتنا عام نہیں تھا جیسا کہ ہم آج راوی دریا کے کنارے مرزا کامراں کی بارہ دری کے باقیات کا ملاحظہ کرتے ہیں تو یہ عمارت تعمیری طور پر اس کے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ آٹھوں پہلوؤں پر بہت گہرے کھلے طاق ہیں اور گنبد بذاتِ خود بالکل دہلی کے روضہ ہمایوں کے گنبد کی طرح کسی قدر معمولی سا شلغم نما بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے برعکس لاہور میں روضہ شاہ چراغ و وزیر خاں کی مسجد وغیرہ کے گنبد بالکل بغیر کسی قسم کی شلغمی مشابہت کے موجود ہیں سب سے بڑھ کر یہ نیلہ گنبد بناوٹ میں دوہرا ہے جس طرح ہمایوں کے مقبرہ دہلی کا گنبد بھی دوہرا ہے اس کا ثبوت ہمیں بآسانی باہر سے سڑک پر سے چلتے ہوئے بھی ایک کمان نما کھڑکی سی نظر آئے گی۔ جو در اصل گنبد کے اندر قبر پر نہیں کھلتی بلکہ ان ہر دو اندرونی اور بیرونی گنبدوں میں جو خلا ہے اس کے اندر جانے کا راستہ ہے جس طرح لاہور میں بادشاہی اور آصف خاں وغیرہ کے گنبدوں میں بھی ہے۔ سب سے عجیب و غریب امر اس گنبد کے متعلق یہ ہے کہ جب ہم اس کے اندر برائے فاتحہ داخل ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہ تمام گنبد کی ساخت squinch arch یعنی قطری کمانوں پر مبنی ہے اور یہی سب سے بڑی خوبی فنِ تعمیر اسلامی کی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ گنبد والی عمارت لاہور میں اس وقت قدیم ترین عمارت ہے خاص کر جہاں تک مقبروں کا تعلق ہے اس کے علاوہ آپ کی ملحقہ مسجد کا ایوان بھی اس روضہ کے ساتھ ہی ایک ہی عہد کی تعمیر معلوم ہوتی ہے جو مسجد کی کمانوں کی ہندسی کیفیت سے واضح ہے اگرچہ اس کے گنبد کم نمایاں ہیں۔ نہ معلوم ان عمارات کے ساتھ اور کیا کیا عمارات تھیں ویسے مؤرخین لاہور نے اپنے زمانہ کی تفصیل عمدگی سے دی ہے جس کا یہاں اعادہ محض بیان کو

طول دینا ہے البتہ اس قدر بیان کرنا ضروری ہے کہ وہ مسجد بقول سید لطیف عہدِ سکھاں میں بطور آرٹلری کوارٹر استعمال ہوتی تھی اور انگریزوں کے عہد کے ابتداء میں یہ میس کوارٹر تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مزار کن کا ہے۔ مورخین لاہور نے اسے ایک مزاری بزرگ عبدالرزاق سبزواری کا لکھا ہے اور آپ بعہد ہمایوں لاہور میں مکہ معظمہ سے تشریف لائے خزینۃ الاصفیاء میں مفتی غلام سرور نے دو بزرگ اس نام سے بیان کئے ہیں ایک تو سید عبدالرزاق بہاکری میں سید عبدالخالق بہاکری جنکا روضہ لاہور میں ہے ان کی وفات ۹۴۲ھ میں ہوئی اور دوسرے سید عبدالرزاق بن عبدالقادر ثانی گیلانی اور بقول اخبار الاخیار آپ کی وفات ۹۵۲ھ میں ہوئی مگر مورخ کے متعلق مقام وفات یا مقبرہ کا کوئی تعین نہیں ہے اس طرح "اذکار ابرار" مصنفہ محمد غوثی جسے در اصل اس نے عہد جہانگیرؒ میں تصنیف کیا تھا۔ اس میں ایک بزرگ عبدالرزاق بن شیخ عبدالفتح مکی کا ذکر ملتا ہے اس سے بھی آپ کے حالات پر سوائے اس کے کوئی زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ کہ آپ کی نسبت بھی ملی ہے۔ اور غوثی نے ان کی تاریخ وفات ۹۸۴ھ لکھی ہے۔ بہر حال اس نام کے اور بزرگانِ اسلام ممکن ہے مل جائیں گے۔ مگر میں ...... آپ کی عمارت روضہ کو دیکھ کر ہی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ عمارت واقعی بالکل ابتدائی عہدِ سلاطین مغل کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس میں کافی اثر سوری فن تعمیر کا ہے۔ سب سے بڑھ کر ان کے عہد کا گنبد کی فیروزی کاشی کاری بھی کافی دلیل ہے۔ جیسا کہ ہم دہلی کی بعض قدیم قبل عہد مغل پر دیکھتے ہیں۔

ہمیں خوب یاد ہے کہ یہ چوک نیلہ گنبد ایک زمانہ میں جبکہ ہسپتال اور

میڈیکل کالج کی عمارات کی ابھی اتنی توسیع نہیں ہوئی تھی۔ بڑے گوشت کے قصابوں سے زیادہ آباد تھا۔ اور جہاں اس وقت پٹیالہ بلاک ایڈورڈ میڈیکل ہے بہت نشیب میں تھا۔ اور ان لوگوں سے بہت گنجان آباد تھا۔ یہاں کھجور کے کافی درخت بھی تھے یہ وہ زمانہ تھا۔ جب اس مسجد نیلہ گنبد میں موجودہ خطیب جناب مولوی گل محمد صاحب کے والد مولٰنا غلام محمد مرحوم خطیب تھے اور اس مسجد کی خطابت کے فرائض ان کے خاندان میں ابتدا سے ہی چلے آئے ہیں۔ اور ان کا ذکر مورخین لاہور نے بھی کیا ہے۔

پرانی انار کلی

یہاں گڑی باغ سے ذرا آگے مغرب کی طرف کر کے بہت مشہور و معروف عمارت پنجاب پبلک لائبریری ہے جو دراصل مقام باغ بارہ دری نواب وزیر خاں بانی وزیر خاں مسجد تھا۔ جس کا ایک حصہ بصورت "بارہ دری باغ نواب وزیر خاں" باقی رہ گیا تھا اور یہ لائبریری یہاں اسی بارہ دری کی عمارت سے شروع ہوئی جو ایک بلند چبوترہ پر ہے سکول آف آرٹ اور میوزیم لاہور کی عمارات سے ملحق ہے۔ مفتی تاج الدین نے ۱۸۶۷ء اس باغ کو "باغ نخلی" کے نام سے موسوم کیا ہے کیونکہ اس میں کئی ہزار اشجار پھلدار تھے اس واسطے لوگ اس کو باغ نخلی کہتے تھے اور اسی نام سے تمام بستی موسوم رہی بالفعل اس باغ سے چند درخت خرما اور ایک بارہ دری موجود ہے جس کو حکام نے کتاب گھر قرار دیا ہے اس باغ سے دور جانب شمال باغ جہاں آرا تھا اب اس موقع میں موضع نواں کوٹ آباد ہے اس باغ

کے جانب مغرب باغ انارکلی تھا جس قدر آبادی ان باغوں کے گرد قریب وجوار میں تھی انہیں اور انہیں کے نام پر معروف تھی۔ جانب شمال باغ انارکلی محلہ پیر بہاون تھا۔ اب اسی موقع پر امام باڑہ ہے۔"

راقم نے ۱۹۳۳ء میں ایک مضمون بعنوان "انارکلی قصہ" انگریزی میں کلکتہ کے ایک رسالہ میں لکھا تھا جس میں علاوہ حقیقت انارکلی کو واضح کرکے یہ بھی نتیجہ نکالا تھا کہ یہ تمام حصہ لاہور باغات سے پُر تھا اس میں کوئی شک نہیں بلکہ راقم کو اپنے عجز کا بھی اقرار ہے کہ کما حقہٗ ان قدیم یادگاروں کو بیان کرنا مواد اور شواہد کی عدم موجودگی میں بہت ذمہ داری کا کام ہے۔

مقبرہ صاحب جمال (انارکلی)

یہ عمارت روضہ زوجہ جہانگیر ہے جسکا نام صاحب جمال تھا وہ شہزادہ پرویز کی والدہ تھی۔ اور خواجہ حسن جو عزیز کوکہ کا قریبی عزیز تھا۔ اسے غلط طور پر مقبرہ انارکلی کہتے ہیں جو الگ بحث ہے جس پر راقم نے الگ کتابی لکھا ہے۔ اس کا انتقال لاہور میں ۱۰۰۸ھ میں ہوا اور اس کا روضہ جو آج بھی موجود ہے ۱۰۲۴ھ میں تعمیر ہوا اور یہ دونوں تاریخیں تعویذ پر کندہ ہیں جو اس کے اندر الگ مشرق کی طرف پڑا ہے۔

مگر سکھوں کے عہد میں یہ مقبرہ راجہ کھڑک سنگھ جانشین مہاراجہ رنجیت سنگھ کی رہائش گاہ تھی اور بعد میں مہاراجہ کے فوجی کمانڈر موسیو ونتورا کی رہائش رہا اور اس نے اسے اپنے طریق پر استعمال کیا اور اُس کے قریب

ہی موسیو الارڈ کا بنگلہ تھا جس کے سامنے ایک پریڈ گراؤنڈ تھی جہاں سکھ رجمنٹ اور بٹالین جوان فرانسیسی کمانڈروں کے زیر کمان تھیں۔

جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا تو اس روضہ کو سینٹ جیمس گرجا کے طور استعمال کیا جانے لگا تو لاش کو نکال کر اسی عمارت کے ایک برج کے تحت دفن کیا گیا جیسا کہ سید لطیف نے اپنی تاریخ لاہور (ص ۱۸۷) میں لکھا ہے۔ اور اسی وقت ہی قبر کا سنگ مرمر کا تعویذ اپنے مرکز سے اٹھا کر ایک طرف کرکے رکھ دیا گیا جہاں اب پڑا ہے یہی وجہ ہے کہ سول سیکریٹیریٹ کے سامنے جو سڑک ہے اسے چرچ روڈ کہتے ہیں۔

ویسے آج یہ روضہ بطور ویسٹ پاکستان ریکارڈ آفس استعمال ہوتا ہے یہاں پر یہ امر وضاحت طلب ہے کہ لاہور میں اسی طرح کافی پرانی عمارتیں عیسائیوں کے قبضہ میں آگئیں اور وہ بطور گرجا استعمال ہو رہی ہیں مثلاً نولکھا گرجا کے احاطہ میں اور اس کے قریب سنٹ اندریو کا گرجا جو دراصل محمد صالح کنبو اور اس کے بھائی عنایت اللہ کنبو کا مقبرہ تھا۔

شاہ چراغ

مقبرہ سید شاہ چراغ بخاری کے پاس بقول مفتی تاج الدین ایک محلہ رسول پورہ بھی تھا۔ جس میں اکثر سید رہتے تھے۔ اور انہوں نے اس بستی کو آباد کرکے رسول پورہ نام رکھا تھا۔ جس کا آج تعین کرنا ایک معمہ ہے۔ چونکہ مزار سید میراں موجدریا آج موجود ہے۔ اس لئے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ

آبادی جو اس مزار کے اِرد گرد تھی۔ محلہ موج دریا بخاری کے نام سے موسوم تھی جیسا کہ لالہ کنہیا لال نے بھی لکھا ہے۔ کہ یہ محلہ لنگر خاں کے محلہ سے بہت قریب ایک نامی گرامی محلہ "تھا" بیوی وڈی کا محلہ بھی اس کو کہتے تھے۔ اور بڑی بی بی بانی محلہ کی زوجہ کا خطاب تھا۔ آخر سکھوں کی غارت اور احمد شاہی حملوں کے وقت اجڑ گیا۔ بانی محلہ سیّد موج دریا کا مقبرہ اب تک وہاں موجود ہے۔ اس محلہ کے وسط میں اب کوٹھی میکلوڈ صاحب بہادر سابق لفٹنٹ گورنر بہادر بنی ہوئی ہے۔ اور کچھ زمین سڑکوں میں آگئی ہے۔ مگر محلہ سیّد شاہ چراغ مزار اور مسجد شاہ چراغ کی وجہ سے اس نام سے آج بھی مشہور ہے۔

سکھوں نے اپنے عہد میں اس مسجد میں میگزین ڈالا ہوا تھا۔ جب انگریزوں کی عملداری ہوئی تو اس کو کوٹھی بنالیا گیا۔ اور میگریگر صاحب، ویڈریل صاحب و مہتمم صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر ان اس میں رہتے رہے پھر اکونٹنٹ کا دفتر اس میں مقیم ہو گیا۔ اس کے بعد عرصہ تک اس میں سیشن جج کی کچہری رہی ہے۔

جب ۱۹۲۵ء میں لاہور میں مسجد شہید گنج کا واقعہ ہوا اور گورنمنٹ نے، مسلمانوں کے جذبات کی کوئی قدر نہ کرتے ہوئے سکھوں کو خوش کرنے کے لئے مسجد شہید گنج کو گرا دیا اور ملک کے طول وعرض میں جب بہت شور ہوا تب گورنمنٹ نے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے یہ ایک سبیل نکالی کہ مسجد شاہ چراغ کو مسلمانوں کے حوالے کر دے۔ چنانچہ اس زمانہ سے یہ مسجد انجمن اسلامیہ کے قبضہ میں ہے اور آج اس کی پرانی تعمیر مسجد کو بھی بحال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تکیہ انبلی والا

یہ مقام انارکلی بازار کے مغرب کی طرف جان محمد روڈ سے سیدھے گذر کر پیسہ اخبار محلہ میں آتے ہوئے اب بھی موجود ہے اور اس کے گرد و پیش آج کیلیکو پرنٹنگ والوں نے کارخانہ لگایا ہے۔ در اصل یہ تمام قبور سادات گیلانی سے متعلق ہیں۔ نہایت زیب و زینت کا کام کیا ہوا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مزارات سے سنگ مرمر اتروا لیا تھا جس سے یہ مزارات گر گئے تھے مگر ایک چبوترہ مع چند قبور کے آج بھی موجود ہے۔ لالہ کنہیا لال نے بیان کیا ہے کہ سید صوفی متوفی سنہ ۱۰۰۲ھ سید عمر۔ سید ہاشم کی قبریں ہیں۔ ان پر ایک گنبد سنگ مرمر کا تھا جسے رنجیت سنگھ نے گروا دیا تھا۔ سید قاسم متوفی سنہ ۱۰۷ھ سید جعفر متوفی سنہ ۱۱۰۷ھ وغیرہ کی قبریں ہیں۔

موج دریا

محلہ موج دریا کے آگے مغرب کی جانب جہاں آج جو عمارات کپور تھلہ ہاؤس کہلاتی ہے اور اس میں انکم ٹیکس کا دفتر ہے ایک کھلا میدان تھا جس کے درمیان میں ایک ہشت پہلو بلند چبوترہ پر ایک ہشت پہلو نصف کروی گنبد مقبرہ سا اب بھی پرانی انارکلی کی سڑک سے زیادہ واضح نظر آتا ہے اور یہ حصہ کرمی باغ کے نام سے ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ مفتی تاج الدین نے بیرون لاہور بستیوں اور باغوں کے تحت چار باغ "باغ ابوالفضل صاحب" باغ و کوٹھی کرم صاحب

"باغ دنتورا صاحب اور گُرسی باغ" مکتے ہیں جو ضرور توجہ کے محتاج ہیں۔ اور یہ ابتدائی یوروپین لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر تو معلوم ہوتا ہے کہ کہیں چھاؤنی کے علاقے میں تھے کیونکہ ہر دو باغ کا بقول مفتی تاج الدین "نام و نشان نہیں رہا ......" مگر ان مقامات میں رونق اور آبادی اور آرائش اس سے زیادہ ہے" ہاں البتہ "باغ دنتورا میدان انارکلی میں تخمیناً بیس بیگہ میں تھا۔ اب آرائش اس کی بہت تھی جس جگہ پر محکمہ لفٹیننٹ گورنر ہے یہاں کوٹھی دو منزلہ بہت عالیشان بنی ہوئی تھی جس پر کئی لاکھ روپیہ صرف ہوئے تھے اب اس کا نام و نشان نہیں۔ مگر عمارات حال اس کے چند حصہ زیادہ تر بہتر ہے گُرسی باغ نہیں تعمیر ہوا تھا ـــــ سرکاری یہ باغ بھی ایلارڈ صاحب کا تھا۔ اس کی لڑکی یہاں دفنائی گئی تھی اس واسطے گُرسی باغ موسوم ہوا جناب میکلوڈ صاحب نے بعہد فنانشلی اس کی تعمیر اور آرائش پر کئی ہزار روپیہ صرف کر کے درمیان میں اس کے کوٹھی عالیشان تعمیر کرائی تھی۔ اب مملوکہ سرکار اہلو والیہ ہے۔" مگر مفتی تاج دین مرحوم کو مغالطہ ہو گیا ہے کیونکہ دراصل یہ قبر موسیو الارڈ کی لڑکی کی ہے اور راقم نے خود وہاں جا کر دیکھا ہے کہ وہاں گنبد کے دروازہ پر فارسی زبان میں ایک کتبہ مرمری سِل پر کندہ کیا ہوا ہے جس سے واضح ہے کہ جنرل الارڈ صاحب کی لڑکی میری شارلٹ کا انتقال ۱۸۲۷ء مطابق ۱۲۴۳ھ میں ہوا اور بقول سید لطیف وہاں ایک اور کتبہ فرنچ زبان میں بھی تھا جو راقم کو کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کو سید لطیف نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الارڈ

کی لڑکی میری شارلوٹ کی وفات ۱۸۲۷ء میں ہوئی۔ بلکہ جب الارڈ کا اپنا انتقال ۱۸۳۹ء بمقام پشاور ہوا تو اُسے بھی اسی گنبد میں لاکر دفن کیا گیا چنانچہ اندرون گنبد دو قبریں آج بھی ہیں اور دوسری قبر خود موسیو الارڈ کی ہے اس میں کوئی شک نہیں اس مقام کو کڑی باغ کے نام سے آج بھی موسوم کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ تسمیہ جو عرفِ عام میں بیان کی جاتی ہے کسی قدر تسلی بخش معلوم نہیں ہوتی یعنے پنجابی زبان میں لڑکی کو کُڑی کہتے ہیں جو زیادہ فصیح نہیں اسی وجہ سے الارڈ کی لڑکی کی قبر سے کُڑی باغ مشہور ہوگیا ہے۔ بقول شخصے یہ الارڈ باغ کے نام سے شمار ہوتا تھا جیسا کہ دنتورا کے نام سے ایک باغ بنایا بعض کے نزدیک لفظ کُڑی سے مراد سر فریڈرک کُڑی ہے۔ جو ۱۸۴۶ء میں لاہور میں بطور ریذیڈنٹ مقرر ہو کر آیا تھا اور اسی نے دیوان مولراج ملتان سے استعفیٰ حاصل کیا تھا اور وہ بھی کہیں اسی مقام پر مقیم رہا تھا جس کی طرف یہ مقام کُڑی باغ مشہور ہوگیا مگر یہاں قبر کی وجہ سے جو الارڈ کی لڑکی کی ہے غلبہ اسی وجہ سے رہا اور یہی آج شمار ہوتا ہے۔ مگر موجودہ صورت میں مقام آج بہت تبدیل ہوچکا ہے اور اس کے شمال میں ایک بہت عظیم الشان مسجد بھی تعمیر ہو رہی ہے اور کوٹھی اہلو والیہ کپور تھلہ ہاؤس کے نام سے مشہور ہے اور آج اس میں پنجاب کا انکم ٹیکس آفس ہے اور پاکستان بننے سے پیشتر یہ عمارت انشورنس کے قبضہ میں تھی۔

بیگم شاہی مسجد کا قرب

شاہنشاہ جہانگیر کے عہد میں لاہور میں اس کی والدہ مریم زمانی نے ایک مسجد ۱۰۳۲ھ میں لاہور کے قلعہ کی مشرقی دیوار کے باہر دروازہ قلعہ کے سامنے تعمیر کی تھی جو آج عام طور پر لاہور میں "بیگم شاہی" مسجد کے نام سے مشہور ہے اور دراصل لاہور کے مستی دروازے کے اندرون واقع ہے راقم نے اس مسجد کے تعمیری محاسن پر الگ اپنے مقام پر لکھا ہے مگر یہاں غرض اس کی مختصر کیفیت بعد سکھاں مقصود ہے کیوں کہ اس مسجد پر جو آفتیں اس عہد میں نازل ہوئیں - ان کو لالہ کنہیا لال اور سید لطیف سے اپنی اپنی تالیفات میں متعلق لاہور میں بالاتفاق صاف لکھا ہے - کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں بارود بھری رہتی تھی۔ اور اس مسجد کو بارود خانہ والی مسجد کے نام سے پکارتے تھے"۔ ہمارے زمانہ یں ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک ہمیں خوب علم ہے - کہ مسجد ہذا کے جنوب کی طرف بالکل صاف میدان ہوتا تھا - اور مسجد کی عقبی دیوار کے مغربی شمالی کونہ پر ایک کنواں مسجد کے باہر تھا اس وقت استعمال نہیں ہوتا تھا - اور عقبی دیوار کے ذرا جنوب کی طرف مسجد کے حمام بھی تھے - جیسا کہ ہم آج بھی شالہ مار باغ کے مشرقی دیوار کے باہر دیکھتے ہیں - راقم نے ان کو نہایت عمدگی سے دیکھا ہے اور اسی زمانہ میں اس میدان میں ہم لوگ کرکٹ کھیلا کرتے تھے - بیگم شاہی مسجد کے امام حضرت مولانا غلام قادر مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ کے پوتے مرحوم مولوی مظہر الحق بن مولوی رفیع الدین مرحوم

بھی اس وقت کھیل میں شرکت کرتے تھے اور یہ تمام حصہ لاہور میں "کھائی" کے نام سے مشہور تھا۔ اس متذکرہ زمانے کے بعد ہم نے دیکھا کہ بعض سکھوں نے اس مسجد کے متذکرہ قدیم شاہی کنویں والے کونہ پر کچھ حصہ زمین پر قبضہ کر کے ایک گوردوارہ قائم کر دیا۔ اور باقاعدہ عمارت کی بنا رکھدی جس پر مسلمانوں میں بہت ہیجان ہوا اور اس جھگڑے نے طول پکڑا۔ حتیٰ کہ لاہور کے سٹی مجسٹریٹ نے جو غالباً اس زمانے میں ایک سکھ صاحب تھے۔ مداخلت کی اور معاملہ ایک طرح سکھوں کے حق میں اس طرح ہوا۔ کہ گورنمنٹ نے مسجد کے عقب میں مسجد کی دیوار سے قریب ایک گز فاصلہ چھوڑ کر یعنی مسجد کی دیوار کے قریب آٹھ نو فٹ بلند کھڑی کر دی گئی۔ اور اس دیوار پر ایک سنگ مرمر کی سل نصب کر دی گئی۔ جس پر انگریزی میں یہ تحریر کندہ کی گئی۔

"کسی قسم کی کوئی تعمیر اس دیوار پر نہ کی جائے جو گورنمنٹ کی ملکیت ہے"۔
سکھوں کے نزدیک یہ گوردوارہ شہید گنج بھائی منی سنگھ جی کا شہید بنگلہ ہے۔

غرض کہ سکھوں نے غالباً دبی عہد رنجیت سنگھ کا تصور کرتے ہوئے استقرار حق قائم کرنے کے خیال سے ایک گوردوارہ باقاعدہ قائم کر دیا اور اس پرانے کنواں مسجد کو ساتھ ملا کر اس میں ٹیوب ویل لگایا۔ اور آج نہ یہاں کوئی حمام قدیم موجود ہے۔ بلکہ اس گوردوارے کے تھوڑے فاصلہ پہ جنوب کی طرف ایک ہندو مندر یا شوالہ بھی گنبد دار ہندوؤں نے یہاں بنا لیا تھا۔ کہ کون پوچھنے والا ہے۔ آج وہ بھی موجود ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس

شاہی مسجد جسے ایک شاہنشاہ کی والدہ نے تعمیر کیا اور پھر قلعہ شاہی کے قریب میں تعمیر ہوئی تھی۔ یعنی خالصتاً شاہی ماحول تھا۔ وہاں کسی غیر اسلامی عمارت کا شبہ تک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

یہاں ایک مزید امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قلعہ کا مشرقی دروازہ جو عام طور پر بند رہتا ہے۔ اس کا چبوترہ تھا۔ جو مسجد بیگم شاہی کی عقبی دیوار سے قریب ۶۰ گز فاصلہ پر ہو گا۔ راقم نے کافی عرصہ ہوا دیکھا تھا۔ کہ اسی چبوترے کے جنوبی کونہ پر ایک سرنگ سی تھی۔ جس میں نیچے کچھ فاصلہ تک بھی اندر جانے کا اتفاق ہوا مگر خوف اور اندھیرے کی وجہ سے آگے جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ گمان غالب ہے کہ یہ سرنگ مسجد کے اندر نیچے نیچے جاتی ہے۔ یعنی شاہی خاندان کے افراد مسجد میں ادائے نماز کے لئے قلعہ کے اندرون سے وہاں سیدھے جا سکتے تھے بعض پرانے لوگ بیان کرتے تھے۔ کہ مسجد ہذا کے شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر ایک راستہ نیچے سے قلعہ کے اندر تک جاتا تھا۔ اور اب بند کر دیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قلعہ لاہور کے اندرون سے ایک سرنگ نیچے نیچے شالامار باغ تک جاتی تھی راقم کا خیال ہے کہ یہ محض ایک روایت ہی ہے۔ غرض کہ ایک مسجد کی زبوں حالی سکھوں کے عہد میں واضح ہے جب کہ اُسے بارُود خانہ بنایا گیا تھا اور آج اس کے ملحق ایک گوردوارہ بھی موجود ہے۔

پری محل

بقول مورخین لاہور یہ حویلی یا محل اندرون شاہ عالمی دروازہ محلوں میں واقع تھا جہاں دو میناروں والی اونچی مسجد آج بھی قائم ہے۔ اس کے قرب میں مشرق رویہ تھا جس کا آج تعین کرنا بھی ناممکن ہے۔ اس کا بانی نواب علی الدین وزیر خاں تھا اور یہ اس کا ذاتی رہائشی مکان تھا۔ یہاں وہ کچہری بھی کرتا تھا جبکہ وہ یہاں بحیثیت صوبہ دار لاہور مقیم تھا۔ لالہ کنہیا لال لکھتے ہیں۔ "اسلامیہ" سلطنت تک یہ مکان بارونق رہا سکھی وقت میں پہلے تو تینوں حاکموں لہنا سنگھ۔ سوبھا سنگھ۔ گوجر سنگھ نے اس کے پتھر نکلوائے اور فروخت کیے۔ پھر مہاراجہ رنجیت سنگھ اس پر قابض ہو گیا اور فوج و گولہ بارود اس میں رکھا۔ بڑی بڑی عمارتیں گرا کر میدان بنایا گیا۔ سرکار انگریزی نے بصیغہ نزول اس کو نیلام کیا اور سلطان ٹھیکیدار نے خرید کر اس کی اینٹیں نکلوائیں اور اس کی اینٹوں سے لنڈہ بازار اور سرائے بنوائیں۔ اب اس عمارت میں سے ایک تو ڈیوڑھی یعنی غربی دروازہ قائم ہے اور جنوبی و غربی دکانیں ہیں۔ جن میں کرایہ دار رہتے ہیں اور کرایہ مہاراجہ جموں لیتے ہیں کیونکہ محمد سلطان کی جائیداد کے ساتھ یہ جائیداد بھی مہاراجہ کے پاس رہن ہے۔ دیوان لالہ سوہن لال سوری مولف عمدۃ التواریخ (دفتر ۳-۱۹۷) نے لکھا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ بتاریخ نہم ماہ ربیع الثانی (۱۲۳۲ھ) پری محل میں تشریف لائے اور اقامت کی اور مبلغ یکصد روپیہ وجہ ضیافت عنایت کیا۔

مسجد پری محل

یہ قدیم مسجد نواب وزیر خاں صوبہ دار نے تعمیر کی تھی شاہ عالمی دروازہ کے اندر نو برد سے دروازہ پری محل سر بازار تعمیر ہوئی تھی بقول لالہ کنہیا لال یہ مسجد نواب وزیر خاں نے خود اس میں نماز ادا کرنے کے لیے تعمیر کی۔ جس کی سادہ عمارت نہایت پختہ تھی اور ۱۸۸۲ء تک آباد تھی۔ مگر آج ہم اس مسجد کی ایک تجدید شدہ صورت شاہ عالمی دروازے کے اندر سرخ رنگ میں دو میناروں والی مسجد دیکھتے ہیں۔ جو دراصل اسی پری محل نواب وزیر خان والی مسجد کی ایک تجدید شدہ صورت ہے اور مشہور و معروف ٹھیکیدار میاں چراغ دین والی گرنے تجدید کرایا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جب گرد و نواح کے مکانات شاہ عالم مارکیٹ بنانے کے لئے گرا دیے گئے تو اس مسجد پری محل کے ساتھ ملحقہ مکانوں کا بھی یہی حشر ہوا مگر اس کے جنوب و شمال کی طرف قدیم شاہی عمارتوں کی دیواریں تھیں جو نمودار ہو گئیں اور آج بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہیں کہ یہاں شاہی عمارات تھیں۔

حسن اتفاق سے اس مسجد کے دروازہ پر آج ایک سنگ مرمر کی محراب نما سل لگی ہوئی ہے جس پر ذیل کے اشعار عربی و فارسی میں بصورت خط نسخ و نستعلیق درج ہیں:۔

للہ الوقف الکریم

سال آغاز تعمیر

چوں ایں مسجد لباس نو پوشید
چراغ دین فروغ نو بہ بخشید
چو تاریخ بنائش جست فیضی،
چراغ د مسجد آمد سال تجدید

۱۳۱۷ ہجری

آج بھی برانڈرتھ روڈ پر چوک دالگراں مشہور ہے اور وہاں کی مسجد بھی انہیں کی بنوائی ہوئی ہے جو ان کی مرحومہ بیگم زیب النساء کے نام پر ہے اسی طرح لاہور میں لوہاری منڈی کی مسجد جو مسجد پٹولیاں کے نام سے مشہور ہے وہ بھی اسی خاندان کی تعمیر ہے۔ یہ بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔

سال اختتام تعمیر

جزی اللہ بانیہم دار النعیم،
و بھدیہم نحو صراط قویم،
ابو الفیض فی تجدیدہ،
بقول لبانیہم نفع د، عظیم،

۱۳۱۸ ہجری

ان اشعار سے واضح ہے کہ مسجد بڑی محل کسی قدیم مسجد کی تجدید شدہ صورت ہے اور حسن اتفاق سے قدیم شاہی زمانہ کی مسجد کا محراب اور اس کی قدیم دیواریں ابھی تک موجود ہیں جن کے اوپر اس مسجد کو قائم کیا گیا ہے۔

مسجد وزیر خاں اور اس کا قرب

شاہجہاں کے عہد میں نواب وزیر خاں حکیم علی الدین نے یہ مسجد لاہور کے مرکز میں ۱۶۳۴ء میں تعمیر کی جس کی تعمیری شان و شوکت واضح ہے مگر سب سے بڑھ کر اس نے اس مسجد کو ایک تعلیمی مرکز بصورت یونیورسٹی بعہد شاہجہاں تعمیر کرکے ایک بہت بڑا ثقافتی ادارہ قائم کیا راقم نے سال گزشتہ بھی اس کے متعلق کافی لکھا ہے مگر بعہد راجہ رنجیت سنگھ سے متعلق اس کے عہد کا مورخ سوہن لال سوری اپنی تالیف عمدۃ التواریخ میں بالکل ابتدائی امورِ سلطنت کے تحت لکھتا ہے۔ جب کہ ابھی تک انتظامِ سلطنت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خوشدامن مائی سداکور وغیرہ کے ہاتھ میں ہی تھے (خلاصہ) مہاراجہ رنجیت سنگھ پہلی دفعہ با فتح و نصرت مع افواج مسجد بادشاہی میں..... تشریف لائے جو قلعہ لاہور کے متصل ہے آپ اس عالیشان عمارت کے معائنہ اور مشاہدہ سے بہت محظوظ ہوئے اور یہاں سے آپ نے توجہ موج مسجد وزیر خاں کی طرف منعطف کی آپ کے ہمراہ آپ کی ساس مائی سداکور بھی تھی مع لشکر بسیار مسجد میں داخل ہوئے مسماۃ موصوفہ نے یہاں آکر کوتوالی شہر لاہور (جس کا آج نام و نشان تک نہیں رہا) کے چبوترہ میں قیام ظفر ارتسام استحکام سے جلوہ افروز ہوئی اور نسق و نظم امورات مالی و ملکی کو سرانجام دیا۔ اور جن سردارانِ لشکر نے ساکنانِ شہر پر غارت و تاراج کا دست دراز کیا تھا۔ ان

کے خلاف مردمان شہر نے جناب کی خدمت میں استغاثہ دائر کیا۔"

اس سے بالکل واضح ہے کہ شہر لاہور کو اس وقت تک بہت ہی بڑا نقصان پہنچ چکا تھا۔ اور شہر کی کوتوالی اس زمانہ میں بھی اسی مقام پر تھی جس مقام کو آج "پرانی کوتوالی" کہتے ہیں ہم نے اسے خوب دیکھا ہے اور یہ عمارت قدیم رومن سٹائل تعمیر پر بڑے بڑے ستونوں پر دو منزلہ کھڑی تھی معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اسے اپنے زمانہ میں یہاں قدیم عمارت کوتوالی کی اپنے نقطہ نگاہ سے مطابق تجدید کی تھی جس کی تائید یوں لالہ کنہیا لال اپنی تاریخ لاہور میں شوالہ راجہ دینا ناتھ کے بیان کے تحت لکھتا ہے جو بالکل ہی قریب تھا کہ اس کوتوالی کی عمارت ۱۸۵۰ء میں تہارن ہل صاحب اسسٹنٹ کمشنر لاہور نے موجودہ کوتوالی کے مکان کو بنانا شروع کیا تو کوتوالی کے سامنے بازار کو وسیع کرنا منظور ہوا مگر اسے بھی ناکافی اور بہت گنجان آبادی میں ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ نے ۱۹۱۴ء میں فروخت کر دیا اور اس کی بجائے دہلی دروازہ کے باہر کوتوالی کی ایک نئی عمارت تعمیر کی جس کا افتتاح ۱۹۱۵ء میں بعنوان عمارت فرخ و فرجام" ہوا۔ جو ایک تاریخی نام ہے اور یہ تاریخی نام علامہ اقبال کا تجویز کردہ ہے۔

تعمیر مسجد وزیر خاں میں سب سے عجیب و غریب قابل ستائش حجروں اور کمروں کا پہلو ہے۔ جو فوراً مسجد کی کرسی پر چڑھتے ہی ملتے ہیں اور اس حصہ مسجد کو عام طور پر انگریزی میں گیلری یا کنڈی ڈور کہتے ہیں جو کسی اور مسجد میں نہیں ہے ان کمروں میں اکثر کتب فروش کاتب اصحاف

نقاش، جلد ساز اپنے پیشہ کے مطابق سکونت رکھتے تھے۔ اس کی تصدیق لالہ کنہیا لعل نے بھی اپنی کتاب تاریخ لاہور میں کی ہے وہ لکھتا ہے۔

سکھوں کے وقت چھاپے کی کوئی کتاب ہندوستان سے پنجاب نہیں آتی تھی قلمی کتابیں کاتب لوگ لکھ کر فروخت کرتے تھے۔ عام تجارت کتابوں کی وزیر خاں کی مسجد کے گنبد بیرونی کے دوکاندار کرتے تھے۔ وہی لوگ جلد بندی کا کام کرتے بعد وہی کتاب فروشی کا بڑا کارخانہ میاں محمد بخش صحاف (والد مولوی فضل الدین صحاف) کا تھا جس کے پاس پچیس تیس کاتب ملازم کتابیں لکھا کرتے تھے۔ اس کارخانہ سے کتابیں تمام پنجاب میں جاتی تھیں بلکہ ایران و خراسان تک سوداگر خرید کرلے جاتے تھے اب وہ کارخانہ درہم برہم ہوگیا ہے اور محمد بخش صحاف، مولوی فضل الدین کا بڑا بیٹا سرکاری مطبع دار کرمای میں بعہدہ سپرنٹنڈنٹی نوکر ہے۔"

غرضیکہ اسی مسجد وزیر خاں میں علوم و فنون و تجارت کتب و جلد بندی کتب کا چرچا ہمیشہ رہا ہے۔ اس مسجد کے اندر صحن میں بھی علماء و فضلا اور درویشوں کے لئے حجرے کافی ہیں۔ ان میں ایک حجرہ نقاشوں کا بھی کہلاتا ہے۔ جو مسجد کے داخل ہونے پر مسجد کے شمالی حصہ میں دائیں طرف تیسرا حجرہ ہے۔ اس میں راقم کے پھوپھا مرحوم نقاش میراں بخش بن میاں قمر الدین نقاشی کرتے رہے۔ اور آج بھی یہ حجرہ مرحوم کے فرزند ارجمند میاں محمد حیات صاحب کے قبضہ میں ہے۔ اور وہ اسلامی نقاشی کا کام قدیم بدایا ستور کرتے ہیں۔ مرحوم بابا میراں بخش نقاش نے کافی عمر پائی اور بہت دور دراز بلکہ لاہور کے باہر ممالک میں بھی

قطعات پر نقاشی وغیرہ کرنے کی وجہ سے مشہور ہیں۔ لاہور میں ان کے بعض تلامذہ آج بھی موجود ہیں۔

مسجد کے جلو خانہ میں یعنے چوک وزیر خاں میں میرے نزدیک راجہ دینا ناتھ کا گنبد دار کنواں اور روضہ سید صوف رح جو وہاں کے کتبات کی شہادت کے مطابق ۱۸۵۷ء کی تعمیر ہیں تصرفات بے جا ہیں۔ کیونکہ جلو خانہ مسجد کی مقاصد اور اس کی موزونیت میں خلل انداز ہیں۔ میں نے سال گزشتہ ہر دو عمارات کے کتبات امروز کی وساطت سے طبع کرائے تھے اور واضح کر دیا تھا۔ کہ یہ عمارات بعد کی ہیں ورنہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ مسجد کے مشرقی بڑے دروازہ کو دہلی دروازہ سے جو صحیح راستہ سفید دروازہ سے بالکل بالمقابل آتا ہے۔ اس میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے ایک اور عمارت تعمیر ہو جائے۔ ورنہ بوقت تعمیر مسجد اس کی تعمیری صورت اور شکل ہی اور ہوتی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے۔ کہ مسجد سکھوں کے عہد سے ابتدائے عہد برٹش اپنے صحیح مصرف میں نہیں رہی۔ اور مسلمان اس سے محروم رہے۔ میرے نزدیک راجہ دینا ناتھ کا کنواں اور اس کے قرب میں ہی اس کی حویلی کا تعمیر ہو جانا نامناسب تھا۔

یہاں ایک امر کی وضاحت معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ دہلی دروازہ انگریزوں کے عہد کی تعمیر ہے۔ اور جو قدیم زمانہ کا اصل دہلی دروازہ تھا وہ اصولاً موجودہ سفید دروازہ سے بالکل سیدھا زاویہ قائمہ کے اصول پر تھا جو لازماً موجودہ یکی دروازہ اور موجودہ دہلی دروازہ کے درمیان کہیں تھا۔ جو غالباً کسی مصلحت کی بنا پر گرا دیا گیا یا خود گر گیا بلکہ اس

کی تائید کنہیا لعل نے (صفحہ ۳۴) بیان کیا ہے کہ جب بادشاہ کابل واپس گیا تو سکھی فوجیں پھر جا بجا پھرنے لگیں کابلی مل جب نائب صوبہ ہوا تو سکھوں نے لاہور کو گھیر لیا اور آخر سکھ دہلی دروازہ کو توڑ کر شہر میں داخل ہوئے۔ جس کے بعد پھر احمد شاہ ابدالی یہاں آیا تو سکھ پھر جنگلوں میں چلے گئے اور رنجیت سنگھ بعد میں حکومت سنبھالتا ہے مگر موجودہ دہلی دروازہ محمد سلطان ٹھیکیدار کا بنوایا ہوا ہے یعنے ابتدا عہد انگلشیہ کی تعمیر ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس وقت انگریزوں نے سہولت کو مدِ نظر رکھ کر اس کے اصل جائے وقوع کو تبدیل کر دیا ہو اور یہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے ورنہ تمام مغل عمارات عام طور پر زاویہ قائمہ پر تعمیر ہوئی ہیں۔

راقم کے عزیز میاں محمد حیات بن میراں بخش نقاش بن میاں عمرالدین نے بیان کیا کہ ایک شخص بخشیش سنگھ نامی جو رنجیت سنگھ کا سالا تھا۔ اور کابلی تنعیف تھا۔ چوک وزیر خاں کے شمالی مغربی کونہ میں حضرت سر بلند کے مزار کو جاتے ہوئے چھبات پر چبارہ میں رہتا تھا یہ شخص بہت خوبصورت سفید پوش عام طور پر اپنے ہاتھ پر شکاری باز رکھتا تھا۔ اور اپنی کلائیوں پر سونے کے کڑے پہنے رکھتا تھا۔ مزید یہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اس مکان میں اس زمانہ سے بیشتر امام غلام محمد مرحوم (امام گاموں) متوفی ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) کے زمانہ میں ایک سکھ سردار رہتا تھا جو آپ سے بڑھتا بھی تھا۔ میاں محمد حیات صاحب کی عمر اس وقت ستر سال سے متجاوز ہے۔ اپنے والد مرحوم کی روایت سے بیان کرتے ہیں۔ کہ وہ شخص بہت ہی برگزیدہ تصوّر کیا جاتا تھا۔ اور سکھ

باہر بازار میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ اِدھر راہ گذر کو بغیر تمیز مذہب و ملت پکڑ کر اس حوض میں کپڑے سمیت پھینک دیتے تھے۔ غرضیکہ یہ نقشہ سکھوں کے ایام کا ہے۔

مزید براں تمام شاہی زمانہ کی مساجد کے قرب میں سکھوں کے عہد میں کسی نہ کسی طرح ایک گوردوارہ ضرور قائم ہو گیا۔ اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ سیاسی طور پر مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو مذہبی اداروں کے ذریعہ ہی بطورِ چیکنگ پوسٹ نگہداشت کی جائے۔ چنانچہ مسجد وزیر خاں کے عقب والی دیوار سے سیدھے ہم چوہٹہ مفتی باقر کو چلے جائیں۔ تو آخر میں ایک بہت بڑا قدیم کنواں ملے گا۔ جہاں آج حلوائی بیٹھتے ہیں اس کے ساتھ ہی سکھوں کے مکان تھے اور وہ مکان ایک گوردوارہ تھا۔ جسے راقم نے بھی دیکھا ہے۔ اور سکھوں کے نزدیک یہ گوردوارہ پہلی پاتشاہی بھائی دنی چند کے ادھار کی جگہ ہے۔

گورنمنٹ نے مسجد وزیر خاں کو کیبڑا مارکیٹ سے پاک کر کے بہت بڑا کارنامہ کیا۔ اور آج ماہ ستمبر ۱۹۵۴ء کے بعد نہ معلوم اور کیا واقع ہونا ہے مگر راقم کی تجویز ہے۔ کہ اس عمارت کی نہایت عمدگی سے ایک اسلامی ثقافتی مرکز کے طور پر تجدید کی جانے کے بعد تمام گرد و نواح کے مکانات خرید کر حاصل کر لینے چاہیں۔ اور اس کے مشرقی جلو خانہ و راستہ دروازہ سفید کو قائم کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ مسجد اپنی تعمیری خوبیوں کی وجہ سے ایران و توران کی عمارات پر بھی سبقت رکھتی ہے۔

مقبرہ شاہ محمدؒ غوثؒ قادری

یہ روضہ دہلی دروازہ کے باہر اور درمیان دہلی دروازہ اور اکبری منڈی واقع ہے اور آپ کا شجرہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ ملتا ہے آپ کا یہاں سنہ ۱۱۵۲ھ میں انتقال ہوا اور یہیں آپ کے مریدوں نے جو بہت بڑا وسیع دائرہ ہے دفن کیا۔ سکھوں کے عہد میں یہ مکان اور وضع کا تھا۔ کنور نونہال سنگھ کے اختیار کے وقت یہ تجویز ہوا کہ لاہور کی فصیل سے آدھ آدھ میل باہر شہر کے چاروں طرف کف دست میدان میں کر دیا جائے۔ عمارتیں گرا دی جائیں۔ درخت کٹوائے جائیں۔ چنانچہ پہلے یہ کام دہلی دروازہ کے باہر سے شروع ہوا اور موسیو ایلارڈ اسی کام پر معمور ہوا چنانچہ مکانوں کا گرنا اور درختوں کا کٹنا شروع ہو گیا۔ شاہ محمد کے مزار کی مسجد گر گئی۔ چار دیواری اندرونی اور بیرونی مسمار ہو گئی اس واقعہ سے لاہور کے عوام ہندو و مسلمانوں میں بہت ہیجان پیدا ہوا لوگ چاہا کہ یہ متبرک مکان گرنے سے بچ جائے۔ مگر کسی نے نہ سنا ابھی مزار کا گرنا باقی تھا۔ لاکنہیا لال بیان کرتا ہے کہ اسی رات راجہ رنجیت سنگھ مر گیا۔ اور کام بسبب حادثہ وفات مہاراجہ ایک روز بند رہا۔ اسی روز قدرت الٰہی نے یہ رنگ دکھلایا کہ جب کنور نونہال سنگھ اپنے باپ کی نعش کو داغ دے کر قلعہ کے دروازہ میں پہنچا تو بسبب زلزلہ آواز

توپ ہائے اسلامی کے دروازہ کی دیوار کی منڈیر گر کر کنور نونہال سنگھ اور میاں اودھم سنگھ کے سر پر آ پڑی اور دونوں نوجوان فرمانروا مر گئے۔ اس واقعہ سے تمام شہر میں شور ہو گیا بسبب گرانے مزار شاہ محمد غوثؒ کے یہ صدمہ کنور نونہال سنگھ پر آیا ہے۔ فی الفور مسمار شدہ عمارت دوبارہ بننی شروع ہو گئی اور چند سال ہی میں وہی درخت جو کاٹے گئے تھے۔ پھر شاخیں پھوٹ کر سر سبز ہو گئے اور مکان کی رونق بدستور قائم ہو گئی۔ جو آج بھی قائم ہے یہیں محلہ فدائی خاں تھا۔

مقبرہ محمدؒ صالح و عنایت اللہ کمبوہ

سید لطیف کے بیان کے مطابق یہ مقبرہ دراصل ایمپریس روڈ پر ریلوے ہیڈ آفس کے شمال کی طرف واقع ہے اور گرجا کے ساتھ اس کا ایک حصہ ہے یا بذاتِ خود بطورِ گرجا استعمال ہوتا ہے۔ محمد صالح مصنف عمل صالح جن کی مسجد موچی دروازہ میں داخل ہوتے ہی مسجد چینیاں والی کے نام سے مشہور ہے اور عنایت اللہ مولف بہارِ دانش دو بہت بڑے فاضل اور امراء عہد شاہ جہانی میں سے تھے اور آج اُن کی ان یادگاروں کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ سکھوں کے عہد میں ان قبور کو سخت صدمہ پہنچا۔ حکومت کا فرض ہے۔ کہ ہر حالت میں ان بزرگوں کی یادگاروں کو محفوظ کرے۔

لاہور کے محلے

لالہ کنہیا لال نے خاص کر اپنی تاریخ لاہور میں لاہور کے ان محلوں کا ذکر کیا ہے جو سکھ عہد میں موجود تھے اس لئے میں نے مختصر طور پر اس سے استفادہ کر کے ذکر کیا ہے اور لاہور کا اس زمانہ کا ماحول سمجھنے میں ان کا بیان لازمی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ فوراً عہد انگلشیہ میں عمل بدل گیا۔ (صفحہ ۹۵) چنانچہ محلہ عزیز مزنگ یا موضع مزنگ میں بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ بلوچوں کی قوم کا غلبہ تھا اکثر ان ہی سے سکھ دربار میں ملازم تھے۔ اس وجہ سے یہ محلہ زیادہ تباہ نہیں ہوا۔ محلہ مرج دریا جو لنگر خانہ کے محلہ کے بہت قریب تھا آخر یہ محلہ سکھوں کے عہد میں اُجڑ گیا اور یہیں انگریزوں نے کوٹھی بنائی تھی جہاں آج کپور تھلہ ہاؤس ہے اسی سے ملا ہوا محلہ شاہ چراغ تھا اس کی بربادی کی علامت یہ ہے کہ آخر یہاں دفاتر اور ہائی کورٹ کی عمارات تعمیر ہوئیں اور یہ مسجد وغیرہ بھی گورنمنٹ کے قبضہ میں رہے اسی سے ملا ہوا شمال کی طرف محلہ ڈلا واڑکی تھا جسے ہم آج نیلہ گنبد کہتے ہیں اسی کے متعلق یہاں اور جگہ بھی لکھا گیا ہے محلہ شاہ شرف جو بھاٹی دروازہ کے باہر آباد تھا مگر اُسے ایسی طرح نیست و نابود کر دیا جیسا کہ شاہ شرف کے تحت لکھا ہے سکھی محلہ نہایت بارونق محلہ تھا مگر رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس کے مکانوں کی اینٹیں

نکالکر فروخت کر دی گئیں اور یہ حصہ آج ہال روڈ کے نام سے آباد ہے۔ اور ۱۸۸ء یہ موجودہ گرجا ان قدیم اسلامی آثاروں پر تعمیر ہو رہا تھا اور یہیں حضرت شاہ اسمٰعیل غزنوی متوفی ۴۵ھ کی قبر ہے جنہوں نے یہاں اشاعت اسلام کی۔ درگاہی شاہ کا محلہ بیرونی آبادی تھا تمام تباہ ہو گیا تھا محض مرزا شاہ درگاہی باقی تھا غالباً یہ محلہ ہال روڈ کے مشرق کی طرف تھا جہاں آج عورتوں کا میڈیکل ہوسٹل ہے۔

شاہدرہ کا محلہ جو سادات گیلان سے منسوب تھا محلہ شاہ درگاہی سے بطرف دکن ملا ہوا تھا رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس محلہ کی عمارات میں سے، ایک پختہ وسیع مسجد شاہ بدر کی رہ گئی تھی اس میں گولہ بارود بھری رہتی تھی اور بارود یہیں بنتی تھی اور اس مسجد کو بھی گرا کر ان تمام عمارات کی انٹیں فروخت کر دیں کنہیا لال نے (صہ۸۶) نہایت مفصل لکھا ہے کہ کسطرح بارود نے تمام تباہی کر دی اور زمین میں گڑھے پڑ گئے لوگ ہلاک ہوئے خوجوں یا خوجیوں کا محلہ یہ دولتمندوں کا محلہ شمار ہوتا تھا۔ بڑی بڑی پختہ حویلیاں تھیں سکھوں نے اس کے لوٹنے کے لئے بہت سے حملے کئے اور خوجے ان کو روپیہ دیکر ٹالتے رہے ایک پختہ مسجد باقی تھی اور ۱۸۵۶ء میں ایک شخص سید شمسی نے اس کا قبضہ حاصل کرنے کے لئے دعوٰے کیا کہ میں اس کو آباد کرونگا اور لوگ نماز پڑھینگے کیونکہ میرا دادا اس کا امام تھا چنانچہ وہ مسجد اُسے مل گئی جسے بعد میں پھر کوٹھی میں منتقل کر دیا گیا یہ محلہ پیر عزیز مزنگ کے جانب مشرق تھا۔

محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر ہال رائڈ کی کوٹھی بھی یہیں کہیں تھی محلہ جاٹ بلدہ
دراصل محلہ عزیز مزنگ کے قریب تھا جہاں جاٹ رہتے تھے محلہ میانی یعنے
لاہور کا عظیم ترین قبرستان جہاں طاہر بندگی قادریؒ کا مزار ہے آخر
سکھ عہد میں یہ محلہ بھی لٹا تو ہزاروں قرآن و کتابیں لوٹ کر لے گئے۔
بعد میں یہ قبرستان بن گیا محلہ دایہ لاڈو دیوان رتن چند کے باغ،
متصل ہے جہاں بڑی بڑی عالیشان عمارتیں تھیں دراصل یہ پرانا آباد محلہ زمین
خاں کو کہ کہلاتا تھا اس حصہ کو بھی غارت گروں نے خوب لوٹا رنجیت سنگھ
کے عہد کی دیواریں باقی تھیں مگر خشت فروشوں نے ان کو گرا کر اینٹوں کو فروخت
کر دیا رتن چند نے جب یہاں باغ بنایا تو عمیق کھنڈروں اور گڑھوں کو ہموار
کرنا پڑا۔ مائی لاڈو کی مسجد میں ایک سادھو نے اپنا گھر بنالیا تھا اور اس میں
ٹھاکروں کی تصاویر رکھدیں تو ایک فقیر نوشاہی نے چند مسلمانوں کی مدد سے مسجد
پر قبضہ کیا۔ مگر محلہ مائی لاڈو کے جانب مشرق الگ محلہ اسی نام زمین
خاں سے مشہور تھا یعنی اکبر کے زمانہ سے اسی نام سے تھا۔ جسے سبب
سے اوّل جسے سنگھ کنہیا نے اسی کو لوٹنا شروع کیا مگر نورالدین خاں
کے پوتے نے دس ہزار روپیہ نذرانہ دے کر اس کو ٹالا تو اس نے وعدہ کیا
کہ آئندہ کو سکھ تم کو نہ ستائے گا۔ مگر وہ وعدہ برائے نام تھا وہ گیا
تو بھنگیوں نے آکر محلہ میں غارتگری شروع کی محلہ والوں نے جسے سنگھ
کی سند دکھلائی مگر انھوں نے ایک نہ مانی ناچار محلہ والے لڑنے پر مستعد
ہوئے اور لڑائی ہوئی تو آخر محلہ والے مکانات خالی کر کے چلے گئے تو یہ موقع

زین خاں کا میدان مشہور ہوا ایک قبرستان فقرائے چشتیہ خیر شاہی کا تھا جہاں پختہ مسجد و مقابر پختہ تھیں مگر مہاراجہ کے زمانہ میں زین خان کی حویلی کی باقیات میں سے ایک پختہ حمام و تہ خانہ موجود تھا اب ان کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ پیروں کا محلہ جسے جہانگیر کے زمانہ میں شاہ ابو المعالی نے آباد کیا تھا جہاں گردی کے زمانہ میں اہل محلہ بھاگ گئے اب پرانی عمارات میں سے روضہ شاہ ابو المعالی پختہ باقی ہے جہاں عیدین کا میلہ زور شور سے لگتا تھا۔ محلہ دائی لانگاہ جو ریلوے اسٹیشن کے قریب جہاں اب اس نام سے ایک قدیم مسجد باقی ہے آباد تھا جسکا اب کوئی نشان تک باقی، نہیں رہا۔ محلہ سید مٹھا متصل گڑھی شاہو تھا سادات باشندے یہاں رہتے تھے جن کے ہزاروں مرید تھے جس وجہ سے محلہ سید مٹھا کہلاتا تھا اگرچہ یہ برباد ہوگیا۔ محلہ تیلی پورہ موضع گنج کے شمال میں آباد تھا جس میں مدرسہ محمد اسمٰعیل المشہور میاں وڈا جاری تھا یہاں نیل کی ایک منڈی تھی جب کوئی حاکم نہ رہا منڈی بند ہوگئی تو غارت گروں نے اُسے لوٹا گو درویش میاں وڈا مدرسہ کے بدستور بیٹھے تھے مگر پھر بھی غارت گران کے کپڑے تک اٹھا کر لے جاتے اور مدرسہ یہاں قائم رہا۔ محلہ گنج کی آبادی کا ثبوت قدیم زمانہ سے ملتا ہے اور حسن اتفاق سے آج بھی نہر کے کنارے وڈے میاں درس کے مشرق میں سڑک کے دوسری طرف یہ ایک موضع آباد ہے اور میاں میر کے ریلوے سٹیشن تک پھیلا ہوا تھا۔ محلہ قصاباں شہر کے مشرق کی طرف قصاباں گاڈ کش کی فنا ہی بستی تھی ہندوؤں

کی وجہ سے بالکل الگ تھا وہاں ایک پختہ عالیشان مسجد تھی سب سے پہلے سکھوں نے اسے غارت کیا مگر ایک مرتبہ انہوں نے ان کا مقابلہ کیا آخر یہ لوگ شہر کے اندر آباد ہو گئے کیونکہ احمد شاہ درانی نے حاکم لاہور کابلی مل کو اس طرح ہدایت کی تھی چونکہ سکھوں کو ان سے جانی دشمنی تھی تو تمام قصابوں نے لکر کابلی مل سے ان کے اخراج کا مطالبہ کیا کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا ان کے حوالے کر دیا جائے ورنہ شہر کو برباد کر دیں گے کابلی مل نے ان سے تنگ آکر چند قصابوں کو ان کے ناک دکان کاٹ کر شہر کے باہر نکال دیا جنہیں سکھوں نے خود دیکھا اور خوش ہو کر چلے گئے ایک پختہ مسجد اس محلہ میں باقی رہ گئی تھی۔ مغل پورہ (از صا) محلہ نو لکھا (از ص ۹۳-۹۸) جن کے متعلق الگ لکھا گیا ہے۔

محلہ نو لکھا و باغ نو لکھا

لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب ایک محلہ نو لکھا نام سے آج بھی مشہور ہے۔ بقول سید محمد لطیف یہاں کبھی ریلوے کے یورپین ملازمین سکونت رکھتے تھے اور سب سے اول یہاں نہایت عمدہ عالیشان عمارات بصورت محل و باغ شہزادہ مرزا کامران برادر ہمایوں بادشاہ نے تعمیر کی تھیں جو اس محلہ نولکھا سے راوی دریا تک پھیلی ہوئی تھیں اور دریائے راوی اس وقت دیوار شہر تک بہتا تھا اور اس محل پر بعد میں آصف خاں نے قبضہ کر لیا۔ اس باغ کے ایک دروازہ پر جو گذشتہ صدی تک قائم تھا بہت عمدہ کاشی کاری کا کام کیا ہوا تھا۔ اس مقام کو نولکھا اس وجہ سے کہا جاتا تھا کیونکہ اس کے

بانی نے اس پر ۹ لاکھ روپیے خرچ کیا تھا۔ اور اسی محلہ نے ۱۸۴۹ء میں منشی محمد اعظم والد سید محمد لطیف مصنف تاریخ لاہور نے ایک انگریزی اخبار جاری کیا تھا (ص ۱۵۷)

چشتی نور احمد مولف تحقیقات چشتی نے اور لالہ کنہیا لال نے اسی نولکھا باغ کی عمارت کو امیر الامرا علی مردان خان کی طرف منسوب کیا ہے جو کسی قدر مزید تحقیق کا محتاج ہے کیونکہ علی مردان خاں شاہ جہان کے دربار میں ۱۰۴۸ھ میں آیا۔ اور اس نے یہاں آکر بیشمار عمارات تعمیر کیں مگر خاص کر باغ نولکھا کے ضمن میں کوئی معاصر تاریخ کسی قسم کی شہادت پیش نہیں کرتی۔ البتہ شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی تالیف سکینۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت میاں میر صاحب کے اکثر رفیقوں سے میں نے سنا ہے کہ ایک روز آپ نولکھا باغ میں گئے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے ایک رفیق کو فرمایا کہ اس درخت سے پوچھ کہ تو کون سی تسبیح پڑھتا ہے۔ جب اس نے درخت کے پاس جاکر پوچھا تو درخت نے کہا کہ "یا نافع" کہتا ہوں وہ سرس کا درخت تھا اور اب تک اس باغ میں موجود ہے۔" اس کے علاوہ دارا شکوہ نے اپنی اسی تالیف میں ایک فہرست ان مقاماتِ لاہور کی دی۔ جہاں حضرت میاں میر صاحب اکثر سیر کے لئے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان میں باغ نولکھا بھی شامل ہے اور اس باغ کے ذکر میں اُس درخت سرس کا بھی ذکر ہے۔ غرضیکہ یہ باغ نولکھا ۱۰۴۹ھ سے قبل لاہور میں موجود تھا۔ بہرحال سید لطیف کے بیان سے اس باغ کا جائے وقوع اور پھر اس کی ابتدا عہد،

سلاطین کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔

اگر سید لطیف کے بیان کو تسلیم کر لیا جائے کہ نولکھا باغ و محل وغیرہ بعد میں آصف خان کے قبضہ میں آ گئے تھے۔ تو پھر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ آصف خاں کا یہ محل اس کی وفات (۱۰۵۱ھ) کے بعد دارا شکوہ کے قبضہ میں آگیا تھا جیسا کہ عملِ صالح میں مذکور ہے۔ اگرچہ راقم کے نزدیک آصف خان کے محلات لاہور میں اسکے علاوہ بھی تھے غرضیکہ یہ تمام علاقہ نولکھا نہایت عالیشان عمارات و باغات سے پر تھا جو بعہد سنگھاں بقول نور احمد چشتی اور لالہ کنہیا لعل یہ باغ سرداراں سندھاوالیہ کے قبضہ میں آگیا تھا اور اس باغ کی بارہ دری کو سردار لہنا سنگھ مجیٹھیہ نے اپنی مرضی کے مطابق ترمیم کر کے عالیشان کوٹھی بنوائی تھی اور اس کا پتھر وغیرہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کام آیا۔

محلہ شاہ کاکو

اس بیان نولکھا کے بعد ہم اس علاقہ میں قدیم معامر یادگار مزار شیخ کاکو چشتی کا وجود پاتے ہیں جو بقول ملا عبد القادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ شیخ اسحاق کاکو لاہوری کے والد کا نام تھا اور اہلِ لاہور آپ سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ وہ دانش مند متبحر عالم، متوکل اور متورع بزرگ تھے کسی اہل دنیا کے ہاں نہیں جاتے تھے۔ کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔ آپ کا مشغلہ ہمیشہ یادِ الٰہی میں مشغول رہنا تھا ۔ بدایونی خود ان کی خدمت میں یعنی شیخ اسحاق

کاکو کی خدمت میں ۹۵۵ھ میں ملک الشعرا فیضی اور شیخ ابو الفضل کی موجودگی میں حاضر ہوا۔ ان کے تلاوندہ میں شیخ سعد اللہ جیسے عالم فاضل تھے۔ آپ کا انتقال ۹۹۶ھ میں ہوا جبکہ آپ کی عمر یک صد سال سے متجاوز تھی۔

آپ کے مزار کو نور احمد چشتی نے اپنی تحقیقات چشتی میں یوں بیان کیا ہے۔

متصل سرائے محمد سلطان ٹھیکیدار شرقرویہ مسجد شہید گنج والا ایک چبوترہ پختہ چونہ گچ چار فٹ مرتفع جس کے اوپر درخت بڑ موجود ہے۔ اس پر مزار پُرانوار حضرت شاہ کاکو چشتی کا ہے۔

بوقت آبادی بیرون شہر لاہور یہ مقام محلہ جواہریاں اور نخاس مشہور تھا۔ یہ حضرت چند مدت یہاں سکونت پذیر رہے اور اپنے آپ کو آپ نے ایسا مخفی رکھا تھا کہ کوئی ان کو جانتا نہیں تھا کہ فقیر ہیں مگر ان کے نام کے باعث یہ محلہ جہاں اب ریلوے سٹیشن ہے۔ محلہ شاہ کاکو چشتی مشہور تھا۔ یہ حضرت بڑی مرفہ الحال بہرحال آسودہ وضع دنیاداراں رکھتے تھے۔ کمترین کے دیکھتے دیکھتے شمال رویہ مزار حضرت شاہ کاکو بہ لب سڑک دروازہ نخاس چینی کے کام والا بڑا بلند عالی شان بنا ہوا تھا اور نشکل اس دروازہ کی بعینہٖ دروازہ مسجد وزیر خاں کے تھی۔ بہت اچھا کانسی کا کام کیا ہوا تھا۔ بادشاہان چوغطہ کے وقت میں وہاں خرید و فروخت اسپاں ہوتی تھی وہ دروازہ دومنزلہ تھا۔ پھر اب بعملداری سرکار گردوں وقار انگریزی وہ دروازہ بھی میاں محمد سلطان صاحب کی مہربانی میں داخل ہوا۔

یعنی مسمار ہوکر نام و نشان اس کا نام کو بھی نہ رہا اور یہ حضرت شاہ کاکو چشتی جب فوت ہوئے تو بحکم آپ کے سادہ سی قبر تیار ہوئی اور تیز قبر پر اس کے ایک بڑا باغیچہ خوبصورت تھا وہ قتل احمد شاہی کے وقت سے خراب دخستہ ہوگیا۔ اب وہاں زراعت بھی ہوتی ہے اور بوقت فصل یہ چیز بھی زراعت میں آجاتی ہے۔ مفتی غلام سرور نے حدیقۃ الاولیا میں آپ کے عرس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"سکھوں کے وقت کا ذکر ہے کہ سکھاں شہید و نگھیوں نے ان کے مزار کے سالانہ عرس جو خوجہ قوم ان کے مرید کرتے ہیں بند کر دیا۔ اور مریدوں سے پوچھا کہ ان کا عرس کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ بزرگ ولی عابد و زاہد تھے۔ اس واسطے ان کا عرس ہوتا ہے۔ یہ سن کر ایک سکھ بولا کہ میں اس کا امتحان کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اس بیر کے درخت پر جو حضرت کی قبر پر ہے۔ چڑھ گیا۔ اور قبر پر پیشاب کرنے لگا اسی وقت پاؤں پھسل کر نیچے آپڑا اور ٹانگ ٹوٹ گئی پھر اس روز سے سکھ مانع عرس نہ ہوئے"۔

ان مذکرہ بالا بیانات سے ہم نے ایک بات پایۂ ثبوت تک پہنچا دی ہے کہ یہ تمام حصہ نولکھا اور محلہ مزار شاہ کاکو چشتی کے نام سے ابتدا عہد مغل سے مشہور تھے۔ جہاں سکھوں نے بعد میں قبضہ کرکے ان مقامات کی تاریخی عظمت کو کم کرنے میں کمی نہیں کی۔ مگر ہمیں اس سے آگے بڑھ کر ان قدیم آثار کا بھی جائزہ لینا چاہیئے جو بیرون دہلی دروازہ اور موچی دروازہ سے شروع ہو کر مزار شاہ کاکو اور نولکھا تک موجود تھے۔ چنانچہ یہاں ہم

مفتی تاج الدین کے بیان کو نقل کرتے ہیں وہ لکھتا ہے۔

چوک دارا

چوک دارا شاہ برج موچیدروازہ سے جانب مشرق ایک گولی بندوق کی ساخت پر دارا شکوہ ابن شاہ جہان اپنے رہنے کو حویلی عالیشان اور بازار مربع اور درمیان میں اس کے چوک مقطع اور ایک باغ بہت عمدہ اور وسیع اور ایک کٹڑہ مبنی بیوت متعدہ بنوایا تھا۔ اس کے بعد اس کا نام چوک دارا قرار پایا۔ اور تا وقتیکہ دار شکوہ جیتا رہا یہ قطعہ نمونہ قطعہ بہشت رہا۔ بعد ویرانی ریاست ذوی الاسلام سکھوں نے یہاں سے لاکھوں روپیہ دفینہ ان لوگوں کا جو یہاں رہتے رہے پایا اور عمارات دارا شکوہ سے ہزاروں روپیہ کا پتھر اور قسم جواہر اتارا مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب کے عہد میں اکثر اینٹ اس کی خندق پر لگی۔ بعد اس کے کشمیریوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ سالہائے دراز تک اینٹ بیچتے رہے اور جن کو قسمت نے یاوری دی۔ ان کو کھنڈروں، سے خزانہ ملا اور جس موقعہ پر خاص حویلی دارا شکوہ کی تھی تا خاتمہ ریاست، سکھاں اس جگہ باروت سرکاری بنتا رہا۔ اس محل میں دہاں جیل زنانہ ہے۔ اور جس جگہ پر باغ دارا شکوہ کا تھا۔ وہاں اب محمد سلطان نے سرائے پختہ بنوایا (کذا) نیز ایک طرف میں چھوٹا سا باغ بنوایا، محلہ جواہر مار (؟) چوک دارا شکوہ کی جانب مشرق و جنوب میں جس کی جانب غرب و شمال میں محلہ حاجی

سوائے تھا۔

سکھوں کا بیجا قبضہ

اس عہد کی تاریخ کا کسی مذہبی جذبہ یا تعصب کو بالائے طاق رکھ کر مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ صحیح حالات معلوم ہو سکیں کہ سکھ قوم نے بالکل آنکھیں بند کر کے اور انصاف کو پس پشت ڈال کر اول تو اس مقام پر یونہی قبضہ کر رکھا ہے اور اس کے علاوہ مسجد کو یا اس کے گرد و نواح کو ناحق ایک شہید گنج گوردوارہ کا نام دے کر اسے گروا دیا اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا احترام تو درکنار کسی قسم کی رواداری سے بھی کام نہیں لیا۔ تمام مورخ بالاتفاق لکھتے ہیں کہ ذکریا خاں کی وفات پر لاہور کی صوبیداری میر مومن خاں کو عطا ہوئی۔ مگر اس کے تھوڑے عرصہ بعد یحییٰ خاں، نواب ذکریا خاں کا بڑا لڑکا وزیر قمرالدین کے معاملہ میں، دلچسپی لینے سے صوبیدار مقرر ہوگیا۔ اس اثناء میں سکھ لٹیروں کے حوصلے اس قدر بڑھے ہوئے تھے۔ کہ انہوں نے دھوبیوں کو جو اوی پر کپڑے دھونے جاتے تھے۔ لوٹ لیا۔ اور ان سکھ لٹیروں کی ایک جماعت نے ایمن آباد کے پاس دو ہزار کی تعداد میں جمع ہو کر ساتھ کے گاؤں وغیرہ سے لگان وصول کرنا شروع کیا۔ لوگوں نے دیوان جسپت رائے کے پاس آکر شکایت کی کہ سکھ انکی بھیڑ اور بکریوں کے گلے کو لے گئے ہیں جسپت رائے نے ان کو وہاں سے بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے آخر

وہ فوج لے کر جا پہنچا۔ اس لڑائی میں ایک سکھ دیوان جسپت رائے کا سر کاٹ کر دوڑ گیا۔ جب اس کے بھائی دیوان لکھپت رائے نے سنا تو آگ بگولا ہو گیا اور اس نے کہا کہ وہ اگرچہ سکھی کے چلانے والا کھتری
تھا لیکن میں اپنے آپ کو کھتری نہیں کہوں گا۔ اگر میں سکھی کو صفحہ ہستی سے مٹا نہ دوں"۔ لکھپت رائے اس وقت وزیر اعلیٰ پنجاب تھا۔ اس نے سکھوں کا تعاقب شمال مشرقی پنجاب تک کیا اور ان کا قتل کیا مگر اپنے بدلہ کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنے ہمراہ قریب ایک ہزار سکھ زنجیروں میں جکڑ کر لاہور آیا۔ اور دہلی دروازہ کے باہر نخاس خانہ میں لا کر ان کا بے رحمی سے ایک ایک قتل کیا اس مقام قتل کو اس وجہ سے شہید گنج نام دیا جس کا صحیح تعین آج تک نہیں ہوا۔ (تاریخ پنجاب بھائی پرمانند۔ سید لطیف۔ کننگھم وغیرہ)

صحیح تاریخ سے انحراف اور ہٹ دھرمی

راقم نے ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۱۱ء تک مسجد شہید گنج کے قرب میں ریلوے ٹیکنیکل سکول میں تعلیم حاصل کی ہے اور اس عرصہ میں اس مسجد کا ہمیشہ مشاہدہ کیا اور یہ مسجد تھی، قبلہ رخ اس کا محراب تھا۔ تین گنبد اور دو مینارے تھے۔ سکھوں نے اس کے اوپر اپنا توپ خانہ قائم کیا۔ نہ معلوم کس بنا پر سکھوں نے اس مسجد کو مقام شہید گنج بنا لیا تھا۔ اس مقام کی جہاں سکھوں کو لکھپت رائے نے قتل کیا اور اسے شہید گنج کہا گیا ہے پورے طور پر صحیح معنوں،

میں تعین بھی نہیں ہو سکا۔ اور خواہ مخواہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر مسجد پر قبضہ کر لیا۔ آخر مسلمانوں نے محض مسجد کو بچانے کے لئے ۱۹۳۵ء میں والہانہ جانیں دیں اور سکھ قوم سے اپیل کی کہ اس مسجد کو مسجد ہی سمجھ کر جو واقعی مسجد تھی مت شہید کرو۔ مگر یہ سکھ قوم ایک نہیں مانی۔ آخر انہوں نے انگریزوں کا سہارا لے کر مسجد کو گرا دیا۔ اگر یہ لوگ اس وقت مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا ذرا بھی احترام کرتے تو ممکن تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو ممنون کر کے اپنے بارِ احسان سے گرویدہ کر لیتے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ کسی سکھ نے بھی آج تک اس عمارت کی صحیح تاریخ اور صحیح واقعات کو مطالعہ کرنے کی محض ضد میں آ کر کوشش ہی نہیں کی کیونکہ راقم کے نزدیک آج بھی اس عمارت سے جسے یہ شہید گنج کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان واقعات کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میرے سامنے اس وقت دو کتابیں بعنوان "تاریخ گوردوارہ شہید گنج لاہور" ایک انگریزی میں مولفہ گنڈا سنگھ اور دوسری اردو میں مولفہ گیانی خزان سنگھ ہیں۔ ہر دو کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مولفین نے محض اپنے سامنے جذبہ انتقام کو رکھ کر ان کو لکھ دیا ہے اور صحیح اصولِ تاریخ دانی بحیثیت ایک مصنف کے ہرگز کام نہیں لیا گیا کم سے کم وہ کسی طرح ان نہایت مختصر صحیح متذکرہ بالا اسباب و علل و واقعات کو ہی مطالعہ کرتے ذرا سوچتے تو شیشے میں اپنا منہ نظر آ جاتا۔ کہ کیا اسی مسجد کے قریب ہی یا مسجد میں ہی ان سکھوں کو لا کر قتل کیا گیا ہو گا اور پھر لکھپت رائے جیسا آدمی ایسا کرتا اسے کیا ضرورت تھی۔ کہ وہ مسلمانوں کی عبادت گاہ میں لا کر ایک مسلمان والی

ملک کے تحت ایسی حرکت کرتا غرضیکہ ان تمام صحیح واقعات کو پشِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ عمارت مسجد ہی نہیں ہے۔ نہ معلوم ان کو کس طرح باور کرا دیا جاتا کہ یہ مسجد ہے اور اس سے ان سیاسی واقعات کا ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محض ضد تھی اور کچھ نہیں جس کا کوئی علاج نہیں۔ حالانکہ اس کے بالکل قریب ہی ایک ایسے بزرگ کی قبر تھی۔ یعنی شیخ کا کو چشتی رحمۃ اللہ علیہ جن کا ذکر بحوالہ مقامی تاریخ سے اوپر کیا گیا ہے اور ہماری تاریخوں میں ابتدائی عہدِ مغل سے ملتا ہے اور انھوں نے تبلیغ اسلام میں حصہ لیا پھر ایسے مزاروں کے قرب میں مساجد لازمی طور پر تعمیر ہوتی رہیں چنانچہ یہ مسجد بھی اسی ضمن میں تھی خواہ اس کی تاریخ یا بانی مسجد کوئی ہو مگر مسجد ضرور تھی اور یہاں کسی غیر مذہب والوں کا کوئی دخل تک نہیں تھا اس قوم کی پستی کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے زعم باطل میں کسی دلیل یا معقول بات کو بھی نہ ماننے بلکہ صحیح تاریخی شواہد و واقعات سے بھی انکار کر دے۔

نخاس (گھوڑوں کی منڈی)

نخاس مکان سرکاری بہ شکل سرائے معمور تھا جو مغلوں کے دوران حکومت میں یہاں گھوڑے بکتے تھے۔ یہ سب ناموری مکان کی بستی محلہ نخاس کہلاتی تھی۔ دروازہ نخاس کا جو کہ مانند دروازہ مسجد وزیر خاں بہت عمدہ وضع قطع اور ہر رنگ آمیزی کاشی و چینی و صنعت کاری و گلکاری متوجہ تھا

تا خاتمہ ریاست سکھاں کھڑا رہا۔ جب محمد سلطان نے سرائے بنوائی وہ اینٹ یہاں کام آئی آگے چل کر مفتی تاج الدین مرحوم نے محلہ شاہ کاکو کے متعلق لکھا ہے کہ دیوار شرقی مسجد مقبوضہ بھائی گنڈا سنگھ گرنتھی الحال معروف شہید سے محلہ نخاس تک فاصلہ گولی بندوق پر گوشہ مشرق و شمال میں تھا۔ شاہ کاکو ایک فقیر خدا پرست تھا۔ جس کی قبر زیرِ دیوار شرقی مسجد ھذا مذکور ہے اس واسطے یہ بستی اسی کے نام پر موسوم ہوئی، اور مفتی تاج الدین نے اس کے بعد اسی محلہ شاہ کاکوئی ملحقہ علاقہ کو محلہ "حاجی نالہ" کے نام سے بیان کیا ہے۔ کہ "دروازہ دہلی سے نخاس تک نولکھا شاہ برج دروازہ زکی کے مقابل جانب شمال نواب علی مردان خاں نے تخمینہ" دو سو بیگہ زمین پر باغ بنوایا تھا جس کا نام نولکھا رکھا[۱]۔

غرضیکہ اس متذکرہ بالا بیان مفتی تاج الدین سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تمام علاقہ بیرون دہلی دروازہ تا حدود نولکھا تاریخی یادگاروں سے پر تھا جن میں خاص کر محلات و باغات دارا شکوہ قابلِ ذکر ہیں اور ان کی جگہ پر زیادہ تر محمد سلطان ٹھیکیدار نے اپنی سرائے تعمیر کی اور مسجد و مزار شاہ کاکو جو شہید گنج کے نام سے معروف تھے بھائی گنڈا سنگھ گرنتھی کے قبضہ میں تھے۔ (تحقیقات چشتی صہ ۶۹۲ میں لکھا ہے)

دہلی دروازہ کے باہر شرقرویہ بازار لنڈا و سرائے ایک مسجد قدیم پختہ و پختہ کار کھڑی ہے عہد چغتائی میں یہ نواح بنام چوک دارا مشہور تھا کیونکہ حویلیاں محمد دارا شکوہ رح کی یہاں تھیں بعد تعلامت عبداللہ برادر

۱؎ لاہور اورینٹل کالج میگزین (۱۹۴۲)

نواب خان بہادر خاتمہ حکومت اہل اسلام کہنا چاہیئے مسجد ہذا پر قبضہ
معہ پسران چلا آتا ہے قابض حال مسمی گنڈا سنگھ نیچے مسجد ہذا دیوار بدیوار
آٹھ دکانیں بھائی جیون سنگھ پدر گنڈا سنگھ نے ۱۸۹۰ء بکرما جیتی میں بنوائی
تھیں جو تا حال موجود ہیں۔ روبرو اس مسجد کے مکان شہید گنج معبد سکھاں
ہے، چونکہ وہاں بازار آباد ہو گیا ہے، دروازہ مسجد شمال رویہ سرراہ محرابی
خشتی اس کی بغلوں میں بطرف شرق و غرب دو کوٹھریاں اس کے اوپر ایک
مکان سہ منزلہ ہے جس کی سقف ادنی میں بھائی کاہن سنگھ صاحب
کا پلنگ بچھا ہوا ہے یہ کاہن سنگھ بڑا متعبد فقیر عرصہ چھ سال کا گزرا ہے
کہ وہ زاویہ نشین عدم ہو گیا ہے اس پلنگ پر وہ استراحت کرتا تھا
اس لیئے تمام سکھ لوگ اس کا ادب کرتے ہیں۔

اوپر مسجد کے تین گنبد اب محرابوں کو بند کر کے طاق تختے سکھوں نے
لگائے ہیں۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس مسجد کا بانی مسمی عبداللہ خانسامان،
دارا شکوہ کا تھا، شمال رویہ مسجد کے فیما بین مکان رسول شاہیاں شہید بنگہ
ایک حمام پختہ عالیشان گنبد کلاں مبینہ دارا شکوہ عبرت افزائے دیدہ
نظارگیاں دشوار پسند کھڑا ہے۔ کرایہ اس کا اب گنڈا سنگھ گوروت سنگھ
لیتے ہیں۔ سبحان اللہ و بحمدہ وہ حمام باہتمام عبداللہ خاں ۱۰۶۰ھ میں
تعمیر ہوا تھا۔ بعد اہتمام اس حمام کے یہ مسجد ۱۰۶۴ھ میں اس تقریب سے
اس لیئے بنوائی گر چند عرصہ کے واسطے وہ عبداللہ خاں کوتوال لاہور مقرر

ہو کر مقام نخاس میں جلوس کیا کرتا تھا۔ اب اس مقام نخاس کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ ابتدائے عملداری انگریزی میں ایک دروازہ کلاں عالیشان قائم کھڑا تھا مگر محمد سلطان صاحب کی مہربانی میں داخل ہو کر مسمار کرایا گیا شرقویہ دیوار بدیوار مسجد ہذا کے ایک حلقہ چار دیواری پختہ بینہ سکھاں ہے۔ اس کے اندر کئی سمادھیں گنبد دار سکھوں کی کھڑی ہیں۔

مسجد عبداللہ خاں

ہمارے مقامی مؤرخین نے اس مسجد کی تعمیر کو عبداللہ خاں خانساماں داراشکوہ کی طرف منسوب کیا ہے، تاریخ سے ہمیں یہ بالوضاحت ملتا ہے کہ عبداللہ خاں دراصل سعید خاں بہادر ظفر جنگ کا چوتھا لڑکا تھا اسے اپنے والد کی وفات پر جو چھبیس سال عہد شاہجہان میں واقع ہوئی منصب دو ہزاری سے سرفراز کیا گیا۔ وہ شہزادہ اورنگ زیب کے ہمراہ کابل رہا۔ اس کے بعد کابل کا والی بھی مقرر ہوا۔ آخر عہد شاہجہانی میں شہزادہ سلطان شکوہ کے ساتھ رہا جنگ فرزنداں شاہجہان برائے حصول تاج و تخت میں وہ ابتداء میں سموگڈھ کی جنگ کے موقع پر داراشکوہ کے ساتھ تھا۔ جب داراشکوہ لاہور آیا تو وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب کے ہمراہ ہو گیا اور پھر وہیں رہا۔ اسے خطاب سعید خانی عطا ہوا۔ ممکن ہے کہ اس نے اپنے دوران قیام میں لاہور میں یہ مسجد

تعمیر کی ہو۔

اس کے متعلق لالہ کنہیا لال نے سرائے محمد سلطان ٹھیکیدار کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ وہ اس لئے پرانی۔ مسجدیں اور عمارتیں عہد شاہان سلف کی یادگار ہیں گرائیں اور یہ کام اس نے صرف اینٹ کی طمع سے کیا...... چنانچہ ایک مسجد نیم بسمل یعنی نیم سمار اب تک سرائے کے بگوشہ کگنی موجود ہے نصف اینٹیں اس کی لگوائی گئی ہیں۔ اور نصف باقی ہیں اگرچہ پہلے اس میں ایک انگریز نے کوٹھی بنائی ہوئی تھی۔ مگر مسجد ثابت تھی اس لئے اسے خرید کر شہید کی یہ زمین جہاں سرائے بنی ہوئی ہے۔ اسی لئے سرکار سے لی۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اس زمین میں پہلے چوک شہزادہ داراشکوہ تھا۔ جس کو غارت گروں نے گرا دیا ہے اس کی بنیاد اس زمین کے اندر ہیں اینٹ یہاں سے مجھ کو بہت ملے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پہلے بنیادیں کھدائیں جب اینٹ بیشمار ہو گئی تو اس سے سرائے کی بنیادیں رکھی گئیں۔ وہ چوک داراشکوہ کے تحت لکھتا ہے۔" انگریزی عہد میں اس مسجد میں ایک انگریز نے کوٹھی بنالی تھی ـــــ "

ایک اَور گمشدہ مسجد

چشتی نور احمد اسی علاقے کے حالات کے ضمن میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "سماوھ صاحب سنگھ صاحب جنوب رویہ بفاصلہ شارع عام ایک مسجد عالیشان پختہ تین گھروں والی تاحال سالم و کامل کھڑی ہے۔ مغرب رویہ

اسی کے باغ ملحقہ سرائے محمد سلطان گویا اس مسجد کا پائیں باغ معلوم ہوتا ہے کہ یہی مسجد ہذا کی زمین سے ایک منزل بلند راہ آمد و رفت مسجد شرق رویہ بیا زیں سولہ زینہ چڑھ کے نیچے بغلوں میں تمام کوٹھریاں قالوتی جو کسی زمانہ میں مکانات حجرہائے درویشاں ہوں گے۔ اوپر صحن مسجد کے گوشہ کنی میں ایک حوض جو اب مٹی سے پُر صحن کے دونوں طرف بطرف شمال و جنوب صحن سے بلند مقام نشست گاہ پرتکلف جس پر فرش خشتی نہایت سلیقہ سے بنا ہوا ہے، سقف مسجد پر جانے کو اس کے زینہ شمال کی طرف اوپر تین گنبد دھرے تا دم تحریر برنگ سیاہ نظر پڑتے ہیں۔ چاروں گوشوں پر چار میناروں کے نشان خورد و طولانی نظر آتے ہیں۔ زیر سقف محرابہائے سہ درہ صحن کے نیچے پس پشت محراب میں اس قطع کی تقسیم عمارت ہوئی ہے کہ سبحان اللہ وبحمدہٖ دیکھتے ہی انسان کی روح خوش ہو جاتی ہے۔ بطور عمارت مغلیہ دالان دار بہت ستھرے زینہ کے شمال کی طرف حجروں کے اندر ایک چاہ کلاں جس کے اندر سرد خانہ بھی دکھائی پڑتا ہے روشندان اس وضع سے رکھے ہوئے ہیں کہ ہر مقام پر بافراغت تمام بیٹھ کر لکھا پڑھا جاتا ہے اگر تفصیل و تشریح تقطیع کی جائے تو خوف طوالت ہے۔ لہٰذا اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ کہ کسی مسجد کے نیچے ایسی عمارت دیکھنے میں نہیں آئی۔ عہد شاہجہانی میں یہ نواح چوک دارا شکوہ تھا۔ اور جہاں اب سرائے محمد سلطان ہے وہاں خاص حویلی زنانہ دارا شکوہ کی تھی۔ [illegible] میں دارا شکوہ نے ستارہ بیگم المعروف قدسیہ بیگم سے شادی کی، قدرت الٰہی سے تا سن پچاس اس کے یہاں کوئی لڑکا بالا تولد نہ ہوا۔ اس نے محمد دارا شکوہ سے اجازت لے کر برائے یادگار یہ مسجد بنوائی اس وقت مسجد ہذا سے لے کر تا مسجد دائی انگلہ ورستہ بازار اس مسجد سے ملحق تھا۔ اب ابتدائی

عملداری سرکار انگریزی میں پہلے چندے ادارہ داخل نزول رہی۔ بعدازاں جناب۔ وسولڈ ڈپٹی صاحب مہتمم مطبع لاہور کرانیکل نے خرید کر کے مقام کوٹھی نیاگول کمرہ قرار دیا۔ بہرحال خوب آراستگی فرمائی۔ جب ولایت جانے لگے تو صاحبان ریلوے کے پاس بہ قیمت چھ ہزار روپے کو بیچ گئے۔ چند صاحبان ریلوے رہتے رہے چنانچہ ولیم صاحب بہادر اسی مقام میں جشتی نور احمد مولف تحقیقات چشتی سے پڑھا کرتے تھے۔ بعدازاں کسی مصلحت کے واسطے صاحبان ریلوے سے محمد سلطان ٹھیکدار نے خرید کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس کو آباد کر کے حوالے مسلمان کردیں گے۔ مگر انہوں نے ادھر توجہ نہ فرمائی۔ اگر وہ یہ تجویز فرماتے تو ممکن تھا ان کا نام چندے یہ مقام ٹھیک رہتا۔ بادی گاہ صاحبان بنا رہا۔ کرایہ آپ لیتے رہے اب بھی کوئی صاحب کرایہ دار اس میں فروکش ہے۔ پس پشت مسجد کو شگاف کر کے تین دریچے نکالے ہیں۔ جن کے آگے برآمدہ چوبی بنا ہے وہاں سے سیر باغیچہ ملحقہ بخوبی ہوتی ہے۔ سرائے محمد سلطان سے لے کر مسجد ہذا سے تھوڑا آگے شرقرویہ تک یہ تمام زمین بہ نسبت آس پاس کے نہایت نیچان میں واقع ہے۔ اگر پیمائش کی جائے تو فرق بیس پچیس گز کا معلوم ہوتا ہے۔ شرقرویہ اس کے تیار ہیں۔ مسجد ہذا اور مسجد والی انگا ایک اور مسجد ایسی ہی کرسی دار خواجہ نور اللہ صاحب خان خانان کی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس مسجد کو خرید کر جناب پادری مسٹر ڈی ڈبلیو فرمین صاحب متعینہ مشن امریکہ نے کوٹھی اپنی بودوباش کے

واسطے بنوائی - چنانچہ مدت مدید اس پر فروکش رہے - بعدازاں صاحبان ریلوے نے ان سے خرید کر مقام دفتر قرار دیا - اب عرصہ چند ماہ سے فراغت احاطہ ریلوے کے واسطے گرا رہے ہیں -

لاہور قدیم کے گم شدہ آثار

چشتی نور احمد کے متذکرہ بالا بیان مسجد

ستارہ بیگم کو اگر نہایت عمدگی سے مطالعہ کیا جائے تو ایک معمہ سا بن جائے گا کیونکہ آج اس کا وجود تک نہیں ہے اور نہ اس کے ملنے کا امکان ہے راقم کا خیال ہے کہ اس عمارت مسجد کے آثار ۱۹۱۰ء تک کسی قدر موجود تھے یعنے یہ میدان ریلوے ٹیکنیکل سکول کی کرکٹ کا گراونڈ تھا جہاں راقم نے بھی اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کئی سال متواتر اس میں کرکٹ وغیرہ کھیلتے رہے اور جب کبھی زور سے موسلا دھار بارش ہوتی تو اکثر زمین سے آثار بطرف مغرب نمودار ہو جاتے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بہت زور سے بارش ہوئی تو زمین بہت نیچے دب گئی اور ایک طویل دیوار سی شمال وجنوب کے رخ نمودار ہوئی جس کے نیچے کچھ کانوں کے آثار بھی نظر آئے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس جگہ سے ذرا آگے مغرب کی طرف قریب دس پندرہ فٹ نیچے باغ تھا اور ایک منڈیر دار دیوار حائل تھی اور اس باغ میں بھی بے شمار قدیم آثار عمارات تھے آج اس گراونڈ میں ریلوے کے کوارٹرز بنائے گئے ہیں باقی رہا یہ کہ یہ عمارت

مسجد بقول چشتی نور احمد ستارہ بیگم المعروف قدسیہ بیگم کی تھی جس کے لیے ہمارے پاس اس کی تصدیق کے لیے کوئی اور سند تو نہیں ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ یہاں ایک شاہی زمانہ کی مسجد تھی جس کی صحیح تفصیل اور مفید، معلومات ہمیں ان کے اپنے متذکرہ بالا بیانات کے سوا اور کہیں نہیں ملتی ان سب کے علاوہ چشتی مرحوم کا یہ لکھنا کہ "مسجد ہذا سے لیکر تا مسجد وائی انگاہ تک دو رستہ بازار اس مسجد کے ملحق تھا" بہت ہی معلومات کا حامل ہے کیونکہ یہ واضح ہو گیا کہ یہ ایک راستہ تھا اور تمام راستہ ان شاہی عمارات سے پر تھا۔ جیسا کہ اوپر تو لکھا۔ محلہ شاہ کاکو وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اس تمام فاصلہ کے مابین مسجد قدسیہ بیگم اور مسجد دائی انگاہ ایک اور مسجد "خواجہ نور اللہ مصاحب خاں خاناں کی تھی جو گرا دی گئی۔ یہ بھی متذکرہ بالا بیانات سے اخذ کر کے ماننا پڑے گا کہ سلطان کی سرائے جو اس کے بانی محمد سلطان ٹھیکیدار نے تعمیر کی وہ واقعی یہاں قدیم تاریخی آثاروں پر تعمیر ہوئی اور ان قدیم آثاروں کے ضائع ہونے میں اس کا بھی حصہ ہے مگر اس نے ان کی جگہ از سر نو باغ و سرائے اپنے نام سے قائم کر دیئے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ آج تک کسی نے اپنے آثاروں کی صحیح معنوں میں حفاظت بھی نہیں کی اور نہ ان کے صحیح حالات قلمبند کرنے کی کوشش کی۔ اگر اس زمانہ میں بھی ہم ذرا توجہ سے کام لیں تو معلوم ہو گا کہ سب سے بڑی ذمہ داری محکمہ آثارِ قدیمہ پر ہے کیونکہ پبلک کے نزدیک یہ ان کا فرض ہے اگر ہمارے سامنے لاہور پر تین کتابیں۔ تحقیقات چشتی از نور احمد چشتی مرحوم تاریخ لاہور از سید محمد لطیف

(انگریزی) اور تاریخ از لالہ کنھیا لال نہ ہوتیں تو ہمارے پاس کوئی اور ذریعہ ان آثاروں کے حالات اور تاریخ حاصل کرنے کا نہیں تھا۔

میدان پرویز آباد

چاہ میراں کے شمال مشرق کی طرف میدان جو موضع خواجہ سعید کے مغرب کی طرف ہے بہت ہی قدیم قبور اعلٰے روضوں اور دیگر عمارات کے کھنڈرات سے پُر ہے۔ مورخین لاہور نے اس تمام میدان کو بوجہ ایک بہت عظیم الشان روضہ کے اُسے عام طور پر پرویز آباد۔ باغ سلطان پرویز اور بعض نے اِسے پرویز منڈی کے نام سے بھی درج کیا ہے۔ یہ مختلف نام جو ایک ہی شخص کی طرف منسوب ہیں وہ شہزادہ سلطان پرویز بن جہانگیر بادشاہ ہے۔ چونکہ داراشکوہ نے اس مقام کو اپنی تالیف "سکینۃ الاولیا" میں باغ سلطان پرویز کے نام سے درج کیا ہے۔ اِس لئے زیادہ تحقیق کا محتاج ہوجاتا ہے اور اس عبارت سکینہ سے واقعی یہی میدان ہی شمار ہوتا ہے۔ اِس شہادت سے ایک اور امر کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے۔ کہ یہ شہزادہ پرویز کا مقبرہ نہیں ہے ورنہ داراشکوہ اسی طرح بیان کرتا۔ واضح رہے۔ کہ تزکِ جہانگیری اور جہانگیر نامہ وغیرہ میں وفات پرویز کو یُوں درج کیا ہے۔

۶ صفر ۱۰۳۵ھ کو شہزادہ پرویز کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ اس وقت معتمد خاں مولف اقبالنامہ جہانگیری بیان کرتا ہے کہ میں بادشاہ کی خدمت میں

موجود تھا۔ بادشاہ نے فی البدیہہ قطع تاریخ عرض کیا:۔

"وفات شہزادہ پرویز"

اس وقت اس کی عمر ۳۸ برس کی تھی۔ اس مدت میں اپنے پدر بزرگوار کے خلاف مزاج کوئی فعل اس سے سرزد نہیں ہوا۔ بادشاہ اس سے نہایت خوش تھا۔ شہزادہ بھی اپنے باپ کی پیروی ہر ایک بات میں کرتا تھا جیسے کہ لباس اور شراب نوشی میں بھی خانجہاں کو حکم ہوا۔ کہ مرحوم کے فرزندوں اور پس ماندگان کو روانہ بارگاہ عالی کرے۔"

واضح رہے کہ اسی اکیسویں سال عہد جہانگیری میں وفات سے پیشتر پرویز کی علالت کی بھی خبر درج ہے۔ کہ وہ علاقہ نظام الملک برہان پور میں بادشاہ کو پہنچی۔ کہ وہ درد قولنج میں بیمار ہے جس میں اس کا انتقال ہوا۔ اور اسی مرض میں شہزادہ شاہ مراد اور شہزادہ اقبال جان بحق ہو چکے تھے۔ غرضیکہ پرویز کو لاہور کے علاقہ چاہ میراں کے اس عالی شان گنبد سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کیونکہ اسے برہان پور سے لا کر جہاں اس کا انتقال ہوا تھا آگرہ میں دفن کیا گیا۔

فن تعمیر کے اعتبار سے یہ روضہ ایک بلند مثمن چبوترہ پر واقعہ ہے۔ اور تمام عمارات بھی مثمن ہے۔ اور اس پر جو گنبد ہے۔ وہ کسی قدر شلغمی ہے اور اپنی شان وشوکت کے اعتبار سے مقبرہ علی مردان خاں سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ سکھوں کے زمانہ میں اس تمام علاقہ میں وہ جنگیں ہوئیں اور کہیں نہیں ہوئیں۔ غرضیکہ سکھوں کے عہد میں یہ ایک رزمگاہ تھی۔ جس میں حقیقت رائے۔ بندہ بہادر پٹھانوں کے واقعات وقوع پذیر ہوئے اور اس روضہ کے قریب ہی ایک چبوترہ شاہ

بلاول کے نام سے مشہور رہا ہے۔ اور یہیں شیر سنگھ کا قتل ہُوا تھا۔

بہر حال مورخین نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ یہ مقبرہ اندر باہر سے سنگِ مر مر کا تھا۔ اور مقبرہ کا فرش بھی سنگ مرمر کا تھا جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے اُتارا گیا۔ خشتی مرمت ہوئی۔ مگر وہ بھی گر گئی ہے۔ اور یہ عام پتھر امرتسر دربار صاحب کی عمارت کے لئے پہنچا دیا گیا۔

آج تک یہ شاندار مقبرہ ایک معمہ ہی بنا رہا ہے۔ اور عوام نے اسے شہزادہ پرویز کا مقبرہ کہہ کر اس کی اصل حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اس حقیقت کا صحیح انکشاف کرنے کے لئے لاہور کی تاریخ بعہد جہانگیر کا مطالعہ کرنا ہو گا۔

سید لطیف (صفحہ ۱۶۰)

درگاہِ شاہ بلاول

آنندرام مخلص (متوفی ۱۱۶۴ھ) نے اپنی تالیف "بدائع وقائع" میں جو محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ-۱۱۶۱ھ) کے عہد میں تالیف ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کی مہم ۱۱۶۱ھ کے ذکر کے ضمن میں نواب حیات اللہ خان الملقب بہ شاہ نواز خاں بن نواب ذکریا خاں بن نواب عبد الصمد خاں دلیر جنگ گورنر لاہور کا ذکر اس وقت ملتا ہے جب احمد شاہ ابدالی نے لاہور کے قریب پہنچکر ایک صابر نامی درویش کو جو احمد شاہ کا خاندانی پیر و مرشد تھا حیات اللہ کے پاس اس سال بھیجا تاکہ وہ احمد خاں کے راستہ میں مزاحمت نہ کرے۔ اور اسی لئے درویش

صابر نامی کو قتل کر دیا۔ لاہور میں صابر شاہ کا مزار بادشاہی مسجد کے عقب میں بلند مثمن چبوترہ پر آج بھی موجود ہے۔ جب احمد شاہ کو اس کا علم ہوا۔ تو اس نے فوراً راوی دریا کو پایاب مقام سے عبور کر کے اپنی فوجوں کو شالامار باغ میں اتار دیا۔ اور اس کے دوسرے روز (۲۱ محرم ۱۱۶۱ھ) ان کو لے کر میدان میں اُتر آیا۔ جس کے لئے بدائع وقائع کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

"یکایک فوج افغانان از راوی
پایاب گذشتہ بباغ شالامار رسید
فردائش بیست ویکم چون افواج
مقہور در میدان شاہ بلاول ودرگاہ
شاہ حسین نمودار شد خواجہ عصمت
اللہ بخشی حیات اللہ خاں بہادر
کہ بادہ ہزار سوار و پنجہزار تفنگچی
و در قلعہ حضرت الیشان و مرزا
عصمت اللہ خاں ولد چین بیگ
خاں کہ با پنجہزار سوار دہمیں قدر
برقنداز در مورچالی قریب درگاہ
شاہ بلاول و پرویز آباد بودند
سوار شدند و بسر دادن توپ دہگا
پرداختند"

یعنی یکایک افغان فوج راوی
عبور کر کے شالامار باغ میں پہنچ
گئیں اور اکیس (۲۱) تاریخ کو جب میدان
شاہ بلاول اور درگاہ شاہ حسین
یعنی مادھو لعل حسین میں موجود
ہو گئیں تو خواجہ عصمت اللہ بخشی
حیات اللہ خاں بہادر بارہ
ہزار سوار پانچ ہزار تفنگچی قلعہ
حضرت الیشاں و مرزا عصمت
اللہ خاں ولد چین بیگ خاں
میں پانچ ہزار سوار اور اسی
قدر برقنداز مورچال قریب درگاہ
شاہ بلاول و پرویز آباد سوار
ہو کر تیار ہو گئے۔

پھر اسی طرح دوسری مرتبہ افغان افواج سرہند سے ربیع الآخر ۱۱۶۱ھ کو عرصہ چہار روز میں نواح لاہور میں پہنچنے کا ذکر ملتا ہے۔ جبکہ خان ذیشان میر مومن خان الملقب بہ معین الملک (میر منو) نائب نظامت ولکھپت رائے منصب مالیات صوبہ نے شہر کا توپ دہکا سے انتظام کیا تھا۔ اس موقعہ پر بھی درگاہ شاہ بلاول کا ذکر یوں ملتا ہے:۔

یعنے اس اقتباس میں لاہور کے اس بڑے میدان کا واقع ذکر ہے۔ جو آج درگاہ مادھو لعل حسین سے لے کر چاہ میراں تک پھیلا ہوا ہے جس میں متذکرہ بالا درگاہیں وغیرہ آج بھی ہیں۔

"لہذا بفاصلہ دو کروہ از بلدہ لاہور کہ متصل
بدرگاہ شاہ بلاول است از دریائے
راوی پایاب گذشت و شب نزدیک
بکوٹلہ عارف خاں مرحوم گذرانده رُخ
بطرف ڈیرہ اسمٰعیل ...... روانہ گشت"

محمد عبدالحمید لاہوری نے اپنے بادشاہ نامہ میں آپ کا ذکر "شیخ بلاول قادری" کے عنوان کے تحت کیا ہے کہ دارالسلطنت (لاہور) میں آپ کا انتقال ہوا۔ اور آپ عزلت میں وقت گزارتے تھے۔ آپ کا اخلاق بہت وسیع تھا۔ اور شب و روز آپ کا لنگر جاری رہتا تھا۔ لوگ وظائف میں معروف رہتے تھے۔ مگر مفتی سرور نے اپنی تالیف "خزینۃ الاصفیا" میں لکھا ہے۔ کہ سید شاہ بلاول بن سید عثمان قادری

لاہور کا انتقال ۱۰۴۶ھ میں ہوا۔ آپ کا مقبرہ برلبِ دریائے راوی تھا۔ (۱۲۵۲ھ) ۱۸۳۶ء میں دریا کا پانی آپ کے مقبرہ کے قریب آگیا تھا۔ بوجہ خوف مسماری مزار حضرت کی نعش کے صندوق کو یہاں سے نکال کر دوسری جگہ قریب ہی دفن کر دیا گیا۔

اس واقع کو لالہ کنہیا لال نے اپنی تاریخ لاہور میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔ "مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں دریا اس قدر نزدیک آگیا تھا۔ کہ ایک دیوار گر گئی۔ مہاراجہ نے فقیر نورالدین کو حکم دیا۔ کہ شاہ بلاول کا صندوق قبر سے نکلوا کر اور جگہ دفن کر دو۔ چنانچہ فقیر نورالدین نے قبر کو کھدوایا۔ اور تابوت نکلوایا اس روز ہزاروں مسلمان شہر لاہور کے اس بزرگ کی زیارت کو گئے اور سب کے روبرو صندوق کھولا گیا دو سو برس کے بعد یہ تابوت زمین سے نکلا۔ مگر نعش کی رنگت ہرگز بدلی نہ تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسی وقت یہ شخص فوت ہوا ہے۔ چنانچہ دوبارہ جنازہ کی نماز پڑھی گئی اور حال کے موقع پر دفن کیا گیا۔ یہ خانقاہ لاہور سے بجانب شرق بفاصلہ ایک کوس کے راجہ دینا ناتھ کے باغ کے متصل ہے۔ چار دیواری پختہ ہے مکان کا دروازہ بجانب جنوب شالامار باغ کے پرانے راستہ کی طرف ہے۔ ۲۸ شعبان کو میلہ ہوتا ہے۔"

شاہ بلاول کی زندگی کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ بالخصوص جبکہ آپ کا تعلق عہد شاہِ جہان سے ہے مگر آپ کی درگاہ سے متعلق جو ہمارا موضوع آثار کے تحت کسی معاصر کی قلم سے یوں ملتا ہے:۔

آپ کی مسجد خانقاہ اور باغیچہ شہر لاہور کے پاس مشرق کی طرف دریائے راوی

کے کنارے بالمقابل ایک ٹیلے پر واقع ہیں۔ یہ مقام نہایت عمدہ سیر گاہ ہے۔
چنانچہ اس مقام اور دریا کے درمیان ایک وسیع ریگستانی قطعہ زمین کے اور کچھ
حائل نہیں۔ زائرین کو خانقاہ کے پائین باغ اور سیر گاہ میں بٹھایا جاتا ہے
اور ان کی کھانا و تبرک سے تواضع کی جاتی ہے۔ خانقاہ کے سامنے جو عالی شان،
خوبصورت مسجد بنی ہوئی تھی جس کے منبر نہایت پاکیزہ اور جس کا حوض نہایت
وسیع اور گہرا تھا۔ اور جس میں عجیب و غریب قسم فوارے چھٹا کرتے تھے۔ مسجد
میں حوض کے گرد قرآن شریف پڑھنے والے قاریوں اور خوش نوا حافظوں
کے گروہ دن رات قرآن خوانی میں مشغول رہتے۔ آپ کے مربیّ و مرشد شیخ شمسؒ
ہیں۔ جو کہ شاہ ابوالمعالیؒ کے مرید تھے۔ آپ اگرچہ فرقہ اور ارادت کی نسبت
دو واسطہ سے حضرت داؤد شیر گڑھی تک پہنچتے ہیں۔ فرماتے تھے حافظ من اپنے
زمانہ کے صالح میرو مہر ے مرشد شمس آفاقؒ سے کامل محبت رکھتے تھے۔ آپ سے
ملنے کے تمنی جہانگیر اور شاہ جہان جیسے شہنشاہ بھی نظر آتے ہیں۔ شاہ میاں میر
صاحب آپ کے معاصر تھے۔ مگر شاہجہان بغیر اجازت آپ کی خدمت میں ایک
مرتبہ حاضر ہوا۔ آپ کے حسنِ کلام۔ اطوار مشائخ کبار اور اخلاق محمدیؐ دیکھ
کر بہت محفوظ ہوا۔ آپ کے ہمراہ شاہزادگان بھی تھے۔ بادشاہ کی میوہ
وغیرہ سے تواضع کی گئی۔ برٹش میوزیم میں ایک تصویر ہے۔ جس میں شاہ جہان
ایک درویش کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ میرا خیال ہے۔ کہ یہ تصویر اسی واقع
کی ہے۔ حضرت ایشاں بھی آپ کے معاصر تھے۔ جن کی درگاہ آپ کی
درگاہ سے جنوب کی طرف آج لاہور میں گورنمنٹ انجنیرنگ یونیورسٹی کے شمالی

دیوار کے ساتھ ہے۔ آپ کی اولاد میں عبدالغنی بن شیخ محمد حیات ہیں۔ شیخ بلاول جو کہ محمد مقیم یعنے محمود شاہ والوں کے ہم صحبت تھے ذکر ملتا ہے رنجیت سنگھ کے عہد کے معاصر مصنف سوہن لال سوری نے بھی اپنی تاریخ عمدۃ التواریخ میں اکثر مقام پر درگاہ شاہ بلاولؒ کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اوقات رنجیت سنگھ نے اسی مقام پر شالامار باغ سے نکل کر یا اِدھر جاتے ہوئے قیام کیا۔ غرضیکہ یہ میدان بقول آنند رام مخلص تذکرہ بالا کے مطابق متصل شالامار درگاہ شاہ حسین (مادھولال حسین) سے لے کر درگاہ شاہ بلاول مع تمام علاقہ پرویز آباد ہمیشہ رزم گاہ بنا رہا ہے۔ بلکہ قبل عہدِ سلاطین مغلیہ بھی اسی مقام پر سلاطین سادات کے زمانہ میں ہی نہیں بلکہ اس سے بھی پیشتر یہاں اکثر جنگیں ہوئیں۔ اور آج یہاں اِن بزرگان کے مزار اور ان کے مزاروں کے کھنڈرات وغیرہ آج تک چاہ میراں تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور یہاں کی ہر اینٹ میں مسلمانوں کی صدیوں کی تاریخ مضمر ہے لاہور کا یہی مقام ہے۔ جہاں اس وقت حُسنِ اتفاق سے قدیم ترین عہدِ اسلامی کی عمارت بصورتِ عید گاہ کھڑی ہے۔ جس پر راقم نے قبل ازیں مفصل لکھ کر محکمہ آثارِ قدیمہ برائے تحفظ توجہ دلا چکا ہے۔ مگر اب محفوظ کیا گیا ہے۔ میں اس سے قبل تحریر کر چکا ہوں۔ کہ یہی مقام شاہ بلاول تھا۔ جہاں شیر سنگھ کو قتل کیا گیا تھا۔ راقم نے بھی یہاں بہت لمبے بہت بڑی بڑی سنگِ مرمر کی جالیدار ایک عمارت کا حصہ دیکھا ہے۔ جو عہدِ شاہ جہاں سے تعلق رکھتی تھیں مگر آج سب کچھ مفقود ہے۔

روضہ حضرت ایشاںؒ

لاہور میں آج یہ روضہ خواجہ خاوند محمود المشہور حضرت ایشاںؒ بیگم پورہ کے مغرب میں انجنیرنگ یونیورسٹی کی عمارات کے پیچھے شمال کی جانب آ گیا ہے۔ ورنہ یہ دور سے سڑک شالا مار پر فوراً نظر آ جاتا تھا۔ اپنے زمانے میں یہ بہت بڑے پایہ کے بزرگ تھے اور مورخین نے لکھا ہے آپ کا سلسلہ نقشبندیہ تھا۔ اصلی وطن آپ کا بخارا تھا۔ آپ نے کافی سیاحت کے بعد لاہور میں آ کر سکونت اختیار کر لی اور ایک خانقاہ تعمیر کی اور یہیں ۱۰۵۲ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مقبرہ فن تعمیر کے اعتبار سے بہت ہی شاندار اور منفرد طرز کی عمارت ہے لیسے بہت بلند سنگین پختہ چونہ گچ مثمن بغدادی سطح پر بنا ہوا ہے اس عمارت کی یہ تعمیری خصوصیت تمام ہندوپاکستان میں بہت اہم اور بہت کمیاب راقم کے علم میں اس وقت محض دو عمارتیں اس طرح تعمیر ہوئیں ایک تو مقبرہ ہمایوں دہلی اور دوسری روضہ تاج محل آگرہ میں۔ اسی روضہ کا گنبد لاہور میں بہت بڑے گنبدوں میں شمار ہوتا ہے مگر شکل وصورت میں یہ گنبد نصف کروی ہے اور شلغمی نہیں ہے سب سے بڑھ کر یہاں مسجد اور روضہ کا الحاق کچھ عجیب طرح ہے۔ مثمن بغدادی سے مراد منظم مساوی الضلع مثمن نہیں ہے بلکہ مربع کے کونے والے ضلعے دوسرے ضلعوں سے چھوٹے ہیں ویسے تمام عمارت قالبوتی اور کماندار ہے سفید گنبد استرکاری کیا ہوا دور سے نظر آتا ہے۔ لالہ کنہیا لال نے اسی روضہ سے متعلق سکھوں کے عہد میں اس کی حالت پر یوں

لکھا ہے:۔

"۔۔۔یہ وہ متمول محلہ لاہور تھا جس کو غارت کر کے احمد شاہ درانی کی فوج مالا مال ہو گئی تھی اور باقی ماندہ شہر کے لوٹنے کی حاجت ان کو نہیں رہی تھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت میں اسی روضہ کے نزدیک سردار گلاب سنگھ پہووندیہ نے چھاونی بنائی جس سے یہ عالیشان مکان برباد ہو گیا چار دیواری گرائی گئی۔ باغ اجڑ گیا۔ مسجد کے صحن کی اینٹیں اور قبروں کی اینٹیں خشت فروشوں نے نکال لیں روضہ میں جرنیل گلاب سنگھ نے باروت بھر دی۔ مزار کا سنگِ مرمر اتار لیا گیا۔ چند سال اسی متبرک روضہ میں باروت اور بھری رہی اور قفل بند رہا۔ جب سکھی سلطنت جاتی رہی اور صاحبان انگریز کا دور دوراں ہوا تو باروت اس روضہ سے نکلوا کر دریا میں پھنکوائی گئی اور روضہ خالی ہوا۔۔۔۔ پھر یہ مکان بدستور ویران ہو گیا۔ اسی مقبرہ و مسجد کی مرمت مولف کتاب کی نگرانی میں بھر اب سرکار کی طرف سے ہوئی۔ ورنہ مسجد کی حالت بہت خراب تھی یقین تھا کہ بہت جلد گر جاتی"۔

اس کے علاوہ متذکرہ بالا آنند رام مخلص کی تالیف "بدائع وقائع" میں بھی اسی روضہ اور اسی عمارات دگرد و نواح کا ذکر احمد شاہ ابدالی کی مہموں میں اکثر آیا ہے:۔

"حیات اللہ خاں بہادر کہ بتقریب فوجداری دوآبہ دراں ضلع بود از جلے خود حرکت کردہ ہشدہم ذیقعدہ سال ۱۱۵۹ھ بسواد دارالسلطنت رسید و در عمارات حضرت ایشان کہ قریب شہر واقعست داخل گردید۔۔"

مقبرہ خان دوران نصرت جنگ

یہ بہت عجیب وغریب مقبرہ آج ریلوے کیرج ورکشاپ کے اندر آگیا اس مقام کو پہلے چنت گڈھ کہتے تھے۔ یہ دو منزلہ عمارت مثمن سطح پر تعمیر ہوئی ہے۔ راقم نے اُسے آج تک دیکھا نہیں۔ کیونکہ ریلوے ورکشاپ کے اندر ہونے کی وجہ سے اس کے دیکھنے کی سہولت میسر نہیں آئی۔ مگر بقول مورخین لاہور بعہد مہاراجہ رنجیت سنگھ جرنیل کورٹ صاحب نے اس مقبرہ کو اپنا مسکن بنایا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی ایک اور عالیشان کوٹھی تعمیر کی اور سکھوں کے زمانہ تک اس پر قبضہ سکھوں ہی کا رہا۔ کورٹ صاحب نے اس کے اندر سے قبر کو گرا کر پختہ فرش بنوا دیا تھا۔ اور قدیم مسجد جو اس کے ملحق و متعلق تھی اس کو بھی کوٹھی میں ملا لیا تھا اور آخر کار سرکار انگریزی نے اس کوٹھی کو فروخت کر دیا اور اس کی اینٹیں لالہ میلہ رام ٹھیکیدار نے لے لی تھیں۔ بقول لطیف یہ مقبرہ کسی زمانہ میں گنبد بجرو والا بھی مشہور تھا۔ کیونکہ سکھوں کے بعد "بجر" لوگ اس میں رہتے تھے۔ اس روضہ کے جنوب کی طرف ایک قدیم مسجد بھی تھی۔ بقولِ مصنف ماثر الامرا خان دوراں نصرتِ جنگ کا انتقال لاہور میں ہوا مگر اسے دفن گوالیار میں کیا گیا۔ (ماثر ۷۵۶/۱)

بہر حال یہ امر مزید تحقیق کا محتاج ہے۔

بیگم پورہ (مغلپورہ)

آج انجنئرنگ یونیورسٹی لاہور بر سڑک شالامار کے شمال مشرقی کونہ میں بر مع چند مکانوں اور ایک شاندار کاشی کاری کی مسجد اور چند روضوں پر مشتمل ہے۔ دراصل اسے خان عبدالصمد خاں دلیر جنگ کے خاندان نے آباد کیا تھا۔ مگر نواب ذکریا خاں کی والدہ بیگم جان کے نام پر بیگم پورہ کے نام سے مشہور ہوا۔ آج بھی یہاں کے کھنڈرات سے واضح ہے کہ یہ تمام آثار اپنے زمانہ میں بہت ہی عالیشان اور فنِ تعمیر کے بہت بڑے شاہکار تھے۔ مگر احمد شاہ درانی نے شہنواز خاں بن نواب ذکریا خاں پر فتح حاصل کر کے اس کو خوب لوٹا اس کے بعد سکھوں کے زمانہ میں اس پر پھر یورش ہوئی۔ انہوں نے تو اسے تین بار لوٹ کر بالکل بے چراغ کر دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت اس قدر اینٹیں اس محلہ کی دیواروں اور بنیادوں سے نکالی گئیں کہ ہزاروں محل تیار ہو گئے جیسا کہ لالہ کنہیا لال نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے نواب زکریا خاں، بہادر کے خاندانی قبرستان کی عمارت جو لاکھ روپیہ کی تھی اس پر زمینداروں نے قبضہ کر لیا اور گاؤں بنا کر خود اسی میں آباد ہو گئے بیگم پورہ کی عمارات کے دو حصے ہیں ایک بیرونی دوسرا اندرونی بیرونی حصہ کے وسط میں دو قبریں مردانی ہیں اور اندرونی حصہ میں زنانی ہیں جن پر لاکھوں روپیہ کا سنگِ مرمر تھا۔ وہ سب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اتروا لیا تھا۔

یہاں مسجد زکریا خاں پر نہایت عمدہ چوکور ٹائیلوں والی کاشی کاری ہے اور بنگالی چھت ہے۔ اگرچہ بعد کے زمانہ کی ہے مگر اسی صنعت فنون لطیفہ، اسلامی کی بہت اہم کڑی ہے۔ اسی طرح یہاں سے ذرا فاصلہ پر مشرق کی طرف مقبرہ شرف النساء بنت نواب زکریا خاں ہے جو ایک بے مثال عمارت ہے۔ ان عمارات کی فنی خوبیوں پر الگ لکھا جائے گا کیونکہ یہ محض فنِ تعمیر سے متعلق ہے۔

غرضیکہ یہ عمارات بیگم پورہ حضرت ایشانؒ کے قرب میں بہت بڑا ذریعہ مطالعہ فنِ تعمیر اسلامی تھیں۔ جہاں طالب علم ایک ہی مقام پر کھڑے ہو کر مختلف ادوار فنِ تعمیر اسلامی بعہدِ مغل مطالعہ کر سکتا ہے اور اسی طرح ادھر مشرق کی طرف شالامار اور درمیان کے آثار بھی بہت اہم تھے جن میں سے آج اکثر مٹ چکے ہیں اور اکثر کے بعض نشان باقی رہ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ حصہ لاہور بہت اہم تھا جب ذرا غور سے مطالعہ کیا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ لاہور بعہد سلاطین مغل یہیں زیادہ آباد تھا اور اسی قسم کے مطالعہ کے لئے ہمیں حصہ موضع خواجہ سعید اور چاہ میراں کو بھی ملانا ہو گا۔

مدرسہ حضرت شیخ اسماعیل المشہور درس میاں وڈا رحمۃ اللہ علیہ

یہ درگاہ لاہور میں میاں میر چھاؤنی سے شالامار باغ کو سیدھی سڑک پر جاتے ہوئے باغ سے بائیں طرف قریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بقول مؤرخین لاہور یہ عالیشان مدرسہ عہد اکبری کی یادگار ہے۔ اور یہاں قرآن کریم کی تدریس ہوتی تھی۔ بقول غوثی مولف اذکار ابرار شیخ اسماعیل یہاں ۹۸۳ھ میں تشریف لائے۔ اور یہاں یہ مدرسہ قائم کیا۔ یہیں آپ نے سفر آخرت کیا۔ اور یہیں آپ کا مزار ہے۔ آپ کا مدرسہ یہاں ۱۰۰۸ھ میں قائم ہوا۔ جس کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

بنا شد ایں مکان نیک بنیاد
برائے درس ہر یک طالب دیں
سروش غیب در سال بنائش
بگفتا درس اسماعیل است ایں
۱۰۰۸ھ

لاہور میں آج بھی اس مقام کو بہت ہی متبرک شمار کیا جاتا ہے۔ اور بے شمار طلباء قرآن یہاں ہر وقت درس حاصل کرتے ہیں۔ اور عوام میں میلں سے درویشوں کی عزت کی جاتی ہے اس کے علاوہ عوام میں "میاں وڈا" کی کئی کراماتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اور اکثر پنجابی شعراء نے ان کو نظم بھی کیا ہے۔ مگر

ایک بات بہت ہی عجیب وغریب ہے۔ یہاں ہر طرف ایک خاص قسم کی سادگی اور خلوص نظر آتا ہے۔ احاطہ میں ایک چبوترہ اندر جنوب کی طرف ہے جس پر چند قبور ہیں ان میں آپ کی قبر بھی آج بھی اسی طرح قدیم زمانہ سے موجود چلی آتی ہے۔ اور اکثر طلبائے علم یہاں کے درختوں کے پتے تبرک سمجھ کر کھاتے ہیں کہ ان کے کھانے سے حافظہ اچھا ہو جائے گا۔ ایک چار دیواری درگاہ کے گرد آج بھی ملتی ہے۔ جس قدر بھی عمارتیں یہاں ہیں۔ وہ زیادہ تر معمولی ہیں اور شاہی عمارات کا ماحول نہیں ہے۔ سوا قدیم مسجد کے۔

عام طور سے بیان کیا جاتا ہے۔ کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں یہ مدرسہ بارونق تھا۔ کیونکہ امرائے سلطنت اس متبرک مکان کا ادب دل وجان سے کرتے تھے۔ مگر اس مدرسہ پر بڑا صدمہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کی سلطنت اور راجہ ہیرا سنگھ کی وزارت کے وقت آیا۔ جب کہ راجہ سوچیت سنگھ جموں سے آکر اس میں فروکش ہوا۔ اور سکھ فوج نے راجہ ہیرا سنگھ کے حکم سے اس پر حملہ کیا۔ اور وہ مارا گیا۔ مکان کی دیواریں توپوں کے گولوں سے مسمار ہو گئیں۔ خانقاہ کے بہت سے درویش مارے گئے جیسا کہ لالہ کنہیا لال نے بیان کیا ہے

شنو تاریخ آں دریائے معنی
کہ عمرش گشت در عشق خدا صرف
دل و جان کرد قربانِ الٰہی
کہ اسماعیل ثانی بود بے خوف

غرضیکہ سکھوں نے بوقت ضرورت اس میں پناہ لی - اور اسے بطور قلعہ استعمال کیا -

مسجد محمد صالح سندھیؒ

یہ عمارت بقول سید لطیف و لالہ کنہیا لال قلعہ گوجر سنگھ سے بجانب مشرق نہائیت مقطع گنبد دار بنی ہوئی ہے - مگر آج اس کا پتہ لگانا ایک معمہ بن گیا ہے - اس کا بانی محمد صالح سندھی دیوان صوبہ لاہور بعہد شاہجہان تھا - جب بیرون شہر کی آبادی سکھوں نے ویران کر دی - تو یہ مسجد بسبب پختگی مسماری سے بچ گئی - سکھوں کے وقت میں دیگر مغل عمارات کی طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے اس میں بھی بارود بھری گئی - انگریزوں کی عملداری میں یہ مسجد خالی ہوئی - تو نواب علی رضا خاں قزلباش نے اس کی مرمت کرائی - راقم کا خیال ہے کہ یہ مسجد اب کہیں نواب پیلس کے قرب میں واقع ہے -

مسجد نقیباں

اسی طرح قلعہ گوجر سنگھ کے گوشہ شمال مغرب کی سمت مکان مسجد نقیباں واقع ہے - اور اس سے کچھ فاصلہ پر روضہ موسیٰ آہنگر ہے اور ساتھ ہی درگاہ جلیل پوہر بندگی بھی ہے - غرضیکہ یہ علاقہ ان قدیم عمارات سے

بدنھا۔

یہ مسجد بہت ہی فراخ اور عالیشان ہے۔ اس کی فراخی ہر سہ گنبد۔ محرابیں اور قدیم انداز کی کاشی کاری وغیرہ سب مل کر یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں ۔ کہ یہ عمارات ابتدائی عہدِ مغل کی ضرور ہے۔ جس کی تعمیری فنی خوبیوں پر الگ لکھا جائے گا۔ بدقسمتی سے یہ عمارت بھی سکھوں کے عہد میں ان کے بارود کے لیئے استعمال ہوئی ۔ اور انگریزوں کی عمل داری میں اسے مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔

مقبرہ علی مردان خاں

اس مقبرہ تک پہنچنے کے لیئے زائرین کو شالامار باغ والی جرنیلی سڑک سے گلابی چوکی کے پاس سے جنوب کی طرف جو سڑک ریلوے ورکشاپ کو جاتی ہے ۔ ریلوے کمپاؤنڈ کی دیوار کے درمیان میں ایک راستہ سے جانا ہوگا جس سے مغرب کی طرف اندر جاکر اس روضہ تک رسائی ہوگی۔ فنِ تعمیر کے اعتبار سے یہ مقبرہ لاہور میں عہدِ شاہجہانی کی عمارات کے ضمن میں بہت اہم حیثیت رکھتا ہے ۔ میں نے معارف ۱۹۳۶ء میں بعنوان علی مردان خاں اس کے حالات مفصل لکھے تھے سکھوں کے عہد میں اس کے ساتھ کی عمارات برباد کر دی گئیں اس کی چار دیواری کی اینٹیں لاہور کے کشمیری خشت فروش اکھاڑ کر لے گئے باقی عمارت سردار گلاب سنگھ پوونڈیہ نے گرا کر چھاؤنی کے لیئے اینٹیں لگائی۔

مگر اب اس چھاؤنی کا بھی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اب محض ایک ڈیوڑھی اور مقبرہ باقی ہے۔ ان کے بھی اکثر حصے واضح کریں گے۔ کہ ان ہی سے اکثر مصالح نکال لیا گیا ہے۔ اس کی ایک ڈیوڑھی جنوب کی طرف بھی تھی۔ جسے سکھوں نے گرادیا تھا۔ موجودہ ڈیوڑھی کا ماتھا اب ریلوے ورکشاپ میں ہے۔ جسے زائرین دیکھ نہیں سکتے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے مقابل اس کے جواب میں کیسی عمارت ہوگی۔ جو ان مغل عمارات کا خاصہ ہے۔ سکھوں کے وقت میں بقول لالہ کنہیا لعل اس ڈیوڑھی کو گوردت سنگھ کرنیل افسر پلٹن مصراں والی نے اپنا مسکن بنایا ہوا تھا۔ اور مقبرہ میں میگزین بھری ہوئی تھی۔ اور اس مقبرہ کی پہلی منزل میں جو سنگِ سرخ و سنگِ ابری کی بڑی بڑی سلیں نصب تھیں، سکھوں نے نہایت سنگ دلی سے اکھاڑ لیں۔

روضہ بہادر خاں

یہ مقبرہ ریلوے لائن کے قریب جو امرتسر کو جاتی ہے نہر کے پل سے شمال مغرب کی طرف تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے۔ عمارت ہشت پہلو ہے۔ بقول مورخین لاہور صاحب مقبرہ اکبر کے عہد کے امرا سے تھا۔ عمارت بہت اعلیٰ اور عظیم الشان ہے۔ اس کا گنبد نصف گر دی ہے۔ اوپر جانے کا راستہ ہے۔ اور ساتھ درمیانی منزل میں غلام گردش ہے۔ یہ مقبرہ سکھوں کے عہد میں ہی بہت بری طرح تباہ ہوا۔ اس کے وسط میں قبر تھی جس

کا تعویز سنگِ مرمر کا تھا۔ مگر اس کا پتھر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اتروا لیا۔ چھاونی کے انگریز افسروں نے اسے ناچ گھر بھی بنایا ہوا تھا۔ اب یہ عمارت خاصی مرمت کی محتاج ہے۔ ورنہ اس کے گرنے میں دیر نہیں۔

بعض دیگر عمارتیں

سکھوں نے اپنے عہدِ حکومت میں تو کوئی ایسی عمارت تعمیر نہیں کی۔ جس سے ان کے ذاتی نظریۂ حُسنِ تعمیر سے بحث کی جائے۔ سوائے اس کے کہ انھوں نے جہاں بھی کوئی عمارت خود تعمیر کی۔ وہ زیادہ اسلامی عمارات کا نقشہ ہی پر بن کر رہ گئی۔ جیسا کہ ہمارے سامنے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ذاتی سمادھ اور اس کی اپنی بنوائی ہوئی سمادھ گورو ارجن دیو ہے۔ اور اگر کسی کو یہ معلوم نہ ہو۔ کہ یہ ایک سکھ گورو کی سمادھ ہے تو فوراً ایک مسلمان اولیاء اللہ کا روضہ تصوّر کرے گا اسی طرح اس سمادھ کا درمیانی گنبد بالکل مغلئی گنبد ہے جو عام اسلامی عمارات بعہد اورنگ زیب میں ملتا ہے۔ اور اس طرح اس کے چاروں کونوں پر مینار نما برجیاں اور کنگرے ہیں۔ غرضیکہ خالصتاً اسلامی عمارات کا اثر یہاں تک ہی نہیں رہا۔ بلکہ امرتسر میں جو سکھوں نے دربار صاحب کی عمارت قائم کی جس کے متعلق عام طور پر سکھ لوگ بیان کیا کرتے ہیں۔ کہ حضرت میاں میر صاحب نے بنا رکھی تھی بالکل واضح ہے اور ایک اسلامی عمارت معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ سکھوں کا اپنا کوئی

طرزِ تعمیر نہیں ہے۔

رنجیت سنگھ سے حضوری باغ کی سنگِ مرمر کی بارہ دری کی تعمیر منسوب کی جاتی ہے۔ ذرا غور سے دیکھنے پر معلوم ہوگا۔ کہ اس پر جس قدر سنگِ مرمر لگا ہوا ہے۔ تمام کا تمام اسلامی عمارات سے لیا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے چبوترے کے فرش کو ایک نظر دیکھئے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے سے ملتا نہیں ہے۔ اگر صحیح معنوں (جس طرح مغل عمارات بنواتے تھے) یہ عمارت تعمیر ہوتی۔ تو اس قسم کا انتظام نہایت عمدگی سے کیا جاتا۔ یہ وہ مسئلہ ہے کہ اس کے لئے زیادہ تر نقشہ جات بنا کر سمجھانے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ذرا شالامار باغ کو ملاحظہ کریں تو اس میں ایک نشیمن سا درجہ اوّل میں کنوئیں پر بنا ہوا ہے جس میں "ولیم مورکرافٹ"، مشہور سیاح جو بعہد رنجیت سنگھ ۱۸۲۰ء میں آیا تھا۔ یہاں ٹھیرا تھا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس نشیمن کی تعمیر نے تمام باغ کی موزونیت و مناظر و مرایا کو خراب کر دیا ہے۔ اس میں بھی کوئی تعمیری ندرت نہیں ہے۔ جو بیان کی جائے۔ سوائے اس کے کہ یہاں رنجیت سنگھ موسم گرما میں نیچے کے کمرہ میں جسے سرد خانہ بھی کہتے ہیں۔ آرام کرتا تھا۔

ان سب کے علاوہ سکھوں نے اپنے گوردوارہ یعنی عبادت گاہ کی بھی کوئی خاص وضع پیش نہیں کی جیسا کہ عام طور پر عام مذاہب کے عبادت خانوں میں کوئی نہ کوئی خاص تعمیری خصوصیت ضرور ہے۔ سوائے

اس کے ایک چھوٹے سائز کی چارپائی پر گرنتھ صاحب کو رکھ کر گوردوارہ قائم کر دیا۔ اور عمارت عموماً اسلامی گنبد نما ہو یا کھلا میدان ہو۔ اگر سمادھ رنجیت سنگھ کا بغور مشاہدہ کیا جائے۔ تو وہاں اکثر ہندو دیویاں اور کرشن کی مورتیاں بھی نظر آئینگی گویا یہ اس امر کی بین دلیل ہے۔ کہ سکھ مذہب ہندو مذہب سے عقیدۃً بہت قریب ہے سکھ عہد میں یہاں کی عمارات کی بے حرمتی کی گئی ۔یا ان کو گرا کر ان کے مصالح کو اپنی عمارات میں استعمال کیا گیا۔ بس یہی کارنامہ ہے۔

لالہ کنہیا لال نے کہنہ مسجد قصاب خانہ والی کے متعلق لکھا ہے۔ کہ مسجد کے حوض کی اینٹیں کرنیل گلاب سنگھ نے اکھڑوا کر اس مسجد کے شمال کی طرف ایک مکان بنوایا تھا۔ اور مسجد میں بارود بھر دی تھی۔ مقبرہ مخدومہ بیگم زوجہ نواب ابوالحسن خاں کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں بارود سے بھر دیا گیا۔ مقبرہ نصرت خاں کو رنجیت سنگھ کے جنرل کورٹ صاحب نے اپنا مسکن بنا لیا تھا حتٰی کہ دائی انگاہ کا مقبرہ تک بھی نہیں بچا تھا۔

مسجد دائی انگاہ

لالہ کنہیا لال نے اس مسجد کے جائے وقوع کو محلہ دائی انگاہ کے نام سے لکھا ہے "یہاں عالیشان حویلیاں امرائے عظام کی تھیں اسے کسی دائی بنام انگاہ نے آباد کیا تھا۔ اس کی فصیل بھی تھی۔ غارتگر

اس میں زبردستی داخل ہوئے تو اہل محلہ مکانات چھوڑ کر چلے گئے اور محلہ ویران ہو گیا اور ان پرانی عمارات میں سے اب محض یہ مسجد ہی باقی رہ گئی ہے۔

یہ مسجد آج لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم اول کے قرب میں جنوب کی طرف دیوار کے باہر واقع ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت اس میں سالہاسال بارود گولہ بھرا رہتا تھا کسی زمانہ میں اس مسجد میں مسٹر کوپ صاحب مہتمم مطبع لاہور کرانیکل نے سرکار سے اجازت لے کر اس مسجد کو کوٹھی میں تبدیل کر لیا تھا۔ تاریخ میں اس مسجد کا ذکر نہیں ملتا۔ اس پر عمارت لکھا ہے کہ اسے کسی امیر مقبول نے خود ۱۰۶۰ھ میں اپنے اہتمام سے تعمیر کیا تھا۔

ویسے یہ مسجد آج خوب آباد ہے اور لاہور کی نہایت خوبصورت شاہی زمانہ کی مساجد میں شمار ہوتی ہے اور راقم نے اس میں اول نماز ماہ جون ۱۹۱۱ء میں پڑھنی شروع کی جبکہ سگنل دیپارٹمنٹ ریلوے میں بندہ ملازم تھا۔

شالامار باغ

یہ باغ لاہور میں اس قدر مشہور و مقبول ہے ہزاروں لوگ ہر روز ہر موسم میں اس کی سیر کیلئے جاتے ہیں۔ شاہ جہان نے اسے ۱۰۴۷ھ میں تعمیر کیا تھا جس کے لئے عام طور پر یہ رباعی پیش کی جاتی ہے۔

چوں شاہ جہاں بادشہ حامیٔ دین
آراستہ شالامار باطرز متین،
تاریخ نہادنے ایں روضۂ رضوان تشیم
گفتا کہ بگو نمونہ خلد بیسر ہن

۱۰۴۷ھ

لالہ کنہیا لال سکھوں کے عہد کے متعلق نہایت دلچسپ حالات لکھتے ہیں۔

محمد شاہ بادشاہ کے عہد تک اس باغ کی خبر گیری بخوبی ہوئی اور نہایت رونق پر رہا۔ جب سلطنت دہلی ضعیف ہو گئی اور سکھوں کا دور شروع ہوا۔ تو تین حاکمان لاہور جو پتھر قیمتی اس میں پاتے اکھڑوائے جاتے اور ایک حوض سنگِ یشب کا جو لاکھوں روپے کی لاگت کا تھا۔ عظیم اللہ باغبان نے ان کی نظر سے چھپا کر اس پر آخر بیلوں کی بنا رکھی تھی۔ آخر یہ بات چھپی نہ رہی اور اس کے دشمن سعید نام نے لہنا سنگھ احمد الحاکم کے پاس آکر مخبری کر دی۔ چنانچہ وہ حوض لہنا سنگھ نے کھدوایا۔ اور ۲۵ ہزار روپے سے اس کا پتھر فروخت کر دیا۔ بعد ازاں رنجیت سنگھ نے اپنے قبضہ و عملداری کے وقت بے شمار سنگِ مرمر کی سلیں بضرورت عمارت دربار امرتسر اتروائیں یعنی بارہ دری کلاں جو بالائے آبشار ہے اس کا تمام پتھر مع جالیوں کے جو منڈیروں پر لگی ہوئی تھیں اتار لیا اور زیر دیوار گیروں کے سلیں دیوالوں پر چھوڑ دیں جو اب تک موجود ہیں۔ پتھر اتارنے

کے بعد سفیدی سے درستی کر دی گئی ۔ چھوٹی بارہ دریوں زیریں باغ، فوارے دار کا پتھر بھی اتروا دیا گیا ۔ غرض بہت پتھر اترا سنگ سرخ کی سلیں بھی اتر کر رام باغ (امرتسر) میں لگائی گئیں ۔ حوض کے جنوبی کنارے آبشار کے پاس تخت شاہی سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حکم دے دیا تھا ۔ کہ یہ تخت یہاں سے اُکھاڑ کر دربار صاحب امرتسر میں پہنچایا جائے تاکہ اس پر گرنتھ صاحب رکھا جائے ۔ مگر اکھاڑنے کے وقت وہ ٹوٹ گیا چنانچہ اب تک ٹوٹا ہوا ہے ۔ کاریگروں نے کہہ دیا تھا کہ اس کا ثابت اکھڑنا اور پھر قائم رہنا مشکل ہے"

راقم محض اس قدر کہنا چاہتا ہے کہ اگر یہ باغ اپنی اصلی حالت میں آج تک رہتا ۔ نہ معلوم وہ اصل شان و شوکت کیا تھی ۔ خیال ہے کہ دنیا بھر میں کوئی عمارت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی ۔

مزار مادھو لال حسین

یہ مزار باغبانپورہ کے شمال میں آج بھی موجود ہے آپکا وجود اولیائے لاہور میں اکبر کے عہد سے ملتا ہے اور آپکا ذکر کئی وجوہ سے اہم ہے مگر خاص کر کے سکھوں کے عہد میں اسقدر بیان کرنا مناسب ہو گا کہ بعہد رنجیت سنگھ یہاں بسنت کا میلہ ہوتا تھا اور بقول سید محمد لطیف (ملک ۱۴۶) ابھی تک یہاں کے لوگوں کو اس زمانہ کی یاد باقی ہے ۔ کہ یہاں یہ سالانہ

میلہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں کس طرح شان وشوکت سے منایا جاتا اور اس میلہ سے محض موسم بہار مقصود ہوتا تھا جبکہ مہاراجہ مع اپنے تمام اہلکاروں اور افواج کے بسنتی لباس میں ملبوس ہوتے اور اس خانقاہ کی زیارت کو جب آتے تو ایک ہزار ایک سو روپیہ چڑھاوا اور ایک جوڑا بسنت کشمیری شال بطور نذرانہ پیش کرتے۔

مگر لالہ کنہیا لال اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت مہاراجہ خود بسنت کے روز یہاں آکر دربار کرتا تھا اور چار دیواری کے شمال و مغرب میں چاندی کا بنگلہ مہاراجہ کے جلوس کے واسطے قائم کیا جاتا تھا اور قلعہ لاہور سے اس خانقاہ تک دو طرفہ فوج پرا باندھ کر کھڑی ہو جاتی تھی دوپہر کے بعد مہاراجہ بڑے تزک و نشان کے ساتھ قلعہ سے سوار ہو کر یہاں آتا اور بنگلہ میں اجلاس کر کے تمام امرائے دربار سے نذریں لیتا اور خلعتیں دیتا پانچسو روپیہ خانقاہ پر چڑھاتا تھا جب سے سکھی سلطنت جاتی رہی عام میلہ ہوتا ہے (ص ۲۳۷) مگر یہ کسی مورخ نے نہیں لکھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یا کسی اور سکھ سردار نے اس مزار کو مرمت کرائی یا اس پر کوئی عمارت تعمیر کی۔ اور تعمیری اعتبار سے یہ عمارت چند یوم کی مہمان ہے۔

مقبرہ نواب میاں خاں

مقبرہ نواب میاں خاں ولد نواب سعد اللہ خاں باغبانپورہ کے مغرب کی طرف بھوگیوال گاؤں کے باہر ایک باغ نواب لطف اللہ خاں کے نام سے ہے۔ یعنی یہ تمام عمارت باغ دراصل روضہ کی تعمیر ہے۔ نواب میاں خاں اور نواب لطف اللہ خاں ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ اور اس تمام باغ نما عمارت میں دراصل روضہ تعمیر ہوا تھا۔ سکھوں کے وقت یہ عمارتیں ویران ہو گئیں۔ سنگ مرمر وغیرہ لوگ اٹھا کر لے گئے۔ راجہ سوچیت سنگھ نے اس باغ میں اس کی مرمت کروا کر سکونت رکھی، بلکہ بعض کے نزدیک یہ تمام عمارت باغ سوچیت سنگھ کے نام سے مشہور ہے، مگر اس کو گذشتہ صدی میں نواب علی رضا خاں قزلباش نے خرید لیا تھا۔ غرضیکہ سکھوں کے عہد میں کافی تبدیلی ہوئی اور سکھوں نے قبر کے تعویذ جو سنگ مرمر کا تھا توڑ دیا۔

مقبرہ زوجہ نواب ابوالحسن

لاہور سے مشرق کی طرف بقول سیّد لطیف شالا مار باغ اور امرتسر سڑک کے درمیان علی مردان خان کے مقبرہ کے جنوب مغرب کی طرف ایک قدیم کنواں ہے جو ایک تالاب کے مانند ہے اور اس کے اندر کافی رہٹ بیک وقت چل سکتے ہیں۔ اس تالاب نما کنویں کی سطح آب کے اوپر ایک کھڑکی نظر آتی ہے جسے بند کر دیا گیا ہے۔ جس کا تعلق کسی زیرِ زمین کمرہ سے تھا، جو ابوالحسن خاں کا مقبرہ تھا۔ مخدومہ بیگم کا گنبد جسے کچھ عرصہ ہوا گرا دیا گیا ہے۔ اس وسیع کنویں کے قریب تھا۔ اس کا گنبد کاشی کاری سے مزین تھا خلاصۃ التواریخ کے بیان کے مطابق مخدومہ بیگم علمی مذاق کی صورت تھی۔ یہ ابوالحسن خاں کی زوجہ تھی مگر بقول محمد صالح کمبو مصنف عمل صالح ($\frac{۳۱۰۱}{۲}$) ممتاز محل کی والدہ یعنی زوجہ نواب آصف خاں کا انتقال لاہور میں جمادی الثانی سنہ ۱۰۴۸ھ میں ہوا، اور اسے یہیں لاہور میں دفن کیا گیا تھا اور ویسے یہ بھی ملتا ہے کہ لاہور میں ابوالحسن تربتی کا انتقال لاہور میں ہوا۔ یہیں دفن ہوا اسلئے ہر حالت میں مقامی مورخین کا تذکرہ بلا بیان تاریخی طور پر مزید تحقیق کا محتاج ہے بہر حال ان کے مندرجہ ذیل الفاظ ہمارے عنوان کے تحت ضرور قابل ملاحظہ ہیں۔ "مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت اس مقبرہ میں جرنیل ایوطیلہ صاحب فرانسیسی نے میگزین بھروا دیا

بہت برسوں تک میگزین بھرا رہا۔ چونکہ گردش دوراں کو اس مقبرہ کی بنیادیں اوکھاڑ دیتی منظور تھیں اس پر بجلی گری اور وہ صدمہ اس عمارت عالیشان کو پہونچا کہ بیچ میں سے شق ہوگیا باروت کو آگ لگ گئی اور عمارت پاش پاش ہوگئی مگر آدھا مقبرہ پھر بھی موجود تھا۔ اس کو بصیغہ نزول صاحبان عالیشان نے نیلام کر دیا اور خشت فروشوں نے اس کی بنیادوں کو ایسا کھودا کہ نشان باقی نہ چھوڑا" انشاء اللہ ان عمارات اور ان حضرات کے حالات مفصل کسی اور جگہ بیان ہوں گے۔

متذکرہ بالا جرنیل ابوبطویلہ کے ضمن میں بحوالہ مورخین لاہور یہ درج کر دیا جائے کہ اس کی رہائشی کوٹھی لاہور میں مزار فتح شاہ سرمست کے شمال کی سمت تھی جس میں بقول لالہ کنہیا لال ۱۸۸۴ء میں ریلوے کے افسر رہتے تھے۔ نہ معلوم آج یہ مزار فتح شاہ سرمست کا موجود بھی ہے۔ کہ نہیں، ویسے یہ ہر حالت میں ریلوے ورکشاپ کے اندر آگیا ہے۔ اس طرح بے شمار عمارتیں ریلوے ورکشاپ اور اسٹیشن کی نذر ہو چکی ہیں۔ جن کا آج کوئی نشان نہیں رہا۔

بُدھو کا آوا

آج شالامار کی جرنیلی سڑک کے جنوبی رخ پر انجینیرنگ یونیورسٹی کے قریب ایک نشان سا بصورت چھوٹا سا مینارہ ایک گول چبوترہ نما سا ملیگا۔ جس پر انگریزی الفاظ میں لکھا ہے کہ یہ بطور یادگار "بُدھو کا آوا" قائم کیا گیا ہے جو کبھی اس مقام پر تھا۔ یعنی اصل "آوا" بھی کبھی یہیں تھا۔ راقم نے بھی اسے خوب دیکھا ہے۔ بلکہ خوب یاد ہے اور اکثر بطور تفنن اس ٹیلے پر جانے کی کوشش بھی کی جو ایک خشک سا پہاڑ تھا جیسا کہ ہم آج لاہور میں شملہ پہاڑی دیکھتے ہیں بلکہ لاہور میں "بدھو کا آوا" پنجابی زبان میں کسی کو اس کے بڑے ہونے کی طنزاً تشبیہ دی جائے تو کہہ دیتے وہ تو "بُدھو کا آوا" ہے۔ یہ قدیم زمانہ میں اینٹوں کا بھٹہ تھا جسکا وجود شاہجہان کے عہد سے بیان کیا جاتا ہے چونکہ اس کا مالک ایک شخص "بُدھو" نامی تھا اس وجہ سے اس کی نسبت سے یہ "بدھو کا آوا" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا گر رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس کی چوٹی پر اس کے فوجی جرنیل ایوطبیلہ فرانسیسی نے ایک عمدہ بنگلہ بنایا تھا جس میں وہ رہتا تھا اور رنجیت سنگھ کے بعد جب اس کے جانشینوں میں خانہ جنگی ہوئی تو اس پر مہاراجہ شیر سنگھ اور راجہ ہیرا سنگھ نے یکے بعد دیگرے اس پر اپنی فوجیں لاہور کے محاصرہ کے لئے جمع کی تھیں اور اس وقت یہ بطور قلعہ کے فتح گڑھ کے نام سے

مشہور تھا۔ ۱۹۱۹ - ۲۰ء میں اسے صاف کر دیا گیا۔ اور ریلوے نے یہ تمام زمین برائے سٹور خرید لی اور اس کی یاد میں متذکرہ بالا نشان قائم کر دیا گیا۔ افسوس آج ہم اس ٹیلہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مگر بعض وقت "بدھو" لفظ سے جو آوا کے مالک کا نام ہے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ٹیلا در اصل بدھ مت کا سٹوپا تھا جو مرور ایام کی وجہ سے اور اسلامی دور دورہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو گیا اور لفظ "بدھ" اس طرح باقی رہ گیا۔

نواں کوٹ کے آثار

نواں کوٹ میں جو مقبرہ اور کسی باغ یا محل کے حصے باقی ہیں مورخین لاہور نے زبردستی اسے زیب النساء بنت اورنگ زیب کی قبر قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ زیب النساء کا انتقال ۱۱۱۳ھ میں دہلی میں ہوا۔ اور وہیں تیس ہزاری باغ میں دفن ہوئی۔ راقم کے نزدیک یہ عمارت نواب افضل خاں شاہجہان کے اول وزیر اعلیٰ کی افضل منزل (۱۰۳۸ھ) کے حصے ہیں۔ اور وہ جب فوت ہوا تو یہیں دفن ہوا مگر سکھوں کے عہد میں اس عمارت کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ یہ حصہ سوبھا سنگھ جو لاہور کے تین حاکموں میں سے ایک تھا کے قبضہ میں تھا ایک حکیم دین ارائیں نے سوبھا سنگھ سے اجازت لے کر اس حصہ کو آباد

کیا تھا۔ جو اب نواں کوٹ کے نام سے مشہور ہے فوارے اور خیابان وغیرہ، سب تباہ کر دیئے اور جب رنجیت سنگھ کو حضوری باغ کے لئے سنگِ مرمر کی ضرورت پیش آئی تو بیشتر سنگ مرمر یہیں کا کام آیا۔

چوبرجی

آج لاہور میں چوبرجی کا علاقہ ملتان روڈ پر بہت ہی مشہور و آباد ہے مگر یہ عمارت دراصل ایک باغ کا دروازہ ہے جسے جہاں آرا بیگم صاحب شاہ جہاں کی سب سے بڑی لڑکی نے ۱۰۵۶ھ میں تعمیر کیا تھا یہ اس پر لکھا ہے۔ افسوس آج تک کسی نے اس طریق سے اس کا کسی نے مطالعہ ہی نہیں کیا اس پر کافی آفتیں آئیں بالخصوص عہد سکھی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کے تمام ملحقہ مکانات کو جو پتھر کے تھے صاف کرائے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ آج تک کسی نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں کی مگرچہ اس عمارت کو دریائے راوی کی طغیانی سے بھی صدمہ لاحق ہوا۔ اور ۱۸۵۹ء میں اس پر بجلی کے گرنے سے ایک مینارہ اور رکونہ ضائع ہو گیا۔ لوگوں نے اس کے کتبہ کے اشعار میں لفظ "زیبندہ" سے زیب النسا تصور کر لیا ہے اور یہی محکمہ آثارِ قدیمہ نے افسوس لکھکر لگایا ہوا ہے۔

لاہور میں قدیم حویلیاں

مغل عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور میں امرائے دربار و دیگر روسائے اپنے رہائش کے مکان تعمیر کئے تھے اور اکثر ان میں کافی مشہور و معروف تھے علی مردان خاں کے بیان میں ملتا ہے کہ جب وہ لاہور میں بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو اسے شاہجہان نے فوراً اعتماد الدولہ کی حویلی لاہور میں رہائش کے لئے عنایت کی اسی طرح احمد معمار کے ذکر میں بیان کیا جاتا ہے کہ لاہور میں اس نے آصف خان یمین الدولہ بن اعتماد الدولہ کے لئے ایک عالیشان مکان تعمیر کیا تھا جسے خانہ آصف کے نام سے لکھا گیا ہے۔ جب مشہور خطاط عبدالرشید دیلمی لاہور میں آیا تو اسے ایک حویلی عنایت ہوئی غرضیکہ اس طرح بیسیوں مکان و حویلیاں یہاں بہت مشہور و معروف تھیں جو ان کے بنانے والوں کے ناموں سے منسوب تھیں۔ بلکہ دارا شکوہ کے مکانات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ چنانچہ بیسوی صدی عیسوی کے ابتدا میں یہاں بے شمار پرانے گھرانے آباد تھے اور ان کی رہائش کے مکانات بھی ان کے شان و شایاں تھے جن میں سے اکثر حویلیاں کہلاتے تھے۔ میرے اپنے ذاتی پرانے مکان واقعہ محلہ چابکسواراں۔ رنگ محل کے قریب جنوب میں محلہ حویلی میاں خاں کے نام سے مشہور آج بھی ہے اگرچہ حویلی تو موجود نہیں البتہ اس کا ایک

دروازہ رنگ محل سے آگے موچی دروازہ کی طرف جاتے ہوئے ملیگا جسے بغور دیکھنے سے اقرار کرنا ہوگا کہ یہ واقعی شاہجہانی عہد کی عمارت کا ایک باقیماندہ حصہ ہے۔ خاص کر اس تمام حصہ موچی دروازہ۔ شاہ عالمی گیٹ علاقہ رنگ محل کے علاوہ اسی طرح اکبری دروازہ کی طرف چلے جائیں حتیٰ کہ دہلی دروازہ کو بھی شامل کرلیں تو ہمیں آج بھی ان قدیم حویلیوں کے نام سے مکان ملینگے بلکہ مزید تلاش سے کچھ ان کے آثار بھی مل جائیں گے آج فرداً فرداً ان کے نام شمار کرنا اور پھر ان کا رقبہ تعین کرنا کوئی آسان امر نہیں ہے۔ بہر حال یہ مسلّم ہے کہ یہاں یہ قدیم عمارتیں تھیں۔

لالہ کنہیا لال نے اپنی تاریخ میں چند ایسی حویلیوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے زمانہ میں ابھی تک بعض سکھ اُمرا کے قبضہ میں تھیں اور ان کے نام سے منسوب تھیں اور ان کی تمام قطع و وضع اور تعمیر مغل ہے۔ چنانچہ اس کی تاریخ میں:۔ حویلی میاں خاں اور حویلی تاتی میاں خاں جو موچی دروازہ کے علاقہ میں تھی چونکہ اس پر کالا پتھر بطور مصالحہ عمارت لگایا گیا تھا اس وجہ سے یہ پتھراں والی حویلی کہلاتی تھی جس پر آخر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دخل کرلیا اور اس میں بارود سازی کا کارخانہ قائم کیا گیا اور بارود کے پھٹنے سے یہ حویلی بھی تباہ ہوگئی (ص ۲۳۱)۔ موچی دروازہ میں داخل ہوتے ہی محمد صالح کمبو کی مسجد سامنے آتی ہے جس کے مکانات یا حویلی وہیں سامنے مشرقی محلہ میں تھی مگر میاں خاں کی اصل حویلی ادھر محلہ چابکسواراں سے مسجد چینیاں تک پھیلی ہوئی تھی اور مسجد کے مشرقی دروازہ پر جو

مکان چھبات والا آج بھی موجود ہے اس کے نیچے ایک تہ خانہ گنبد دار ملیگا
نہ معلوم کسی کا یہ مقبرہ تھا جو حویلی کا حصہ تھا اور اس کے جنوب کی طرف
کاشی کاری کے نقش ونگار ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ محلہ سادھواں سے
گذر کر ہم محلہ چہل بیبیاں میں پہنچتے ہیں تو ہم مبارک حویلی تک رسائی کرتے ہیں
یہ حویلی مغل زمانہ کی تعمیر ہے۔ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں جب شاہ شجاع
الملک کابل سے یہاں آیا تو اسے رہائش کے لئے یہ حویلی دی گئی اور رنجیت
سنگھ نے اس سے یہیں کوہ نور ہیرا چھینا تھا بعد میں اسے نواب علی رضا
خاں قزلباس کے پاس بیع ہو گئی جس نے کافی تغیر و تبدل کیا اس حویلی
میں عشرہ محرم میں مجلسیں ہوتی ہیں پھر اس خاندان کے جانشینوں نواب نوازش
علی۔ ناصر علی وغیرہ نے اس کے تقسیم شدہ حصوں کو مختلف نام دے دیئے
مگر مرکزی طور پر مبارک حویلی ہی رہی۔ پری محل جسے نواب وزیر خاں بانی
مسجد وزیر خاں نے بنوایا تھا اور یہ شاہ عالمی دروازہ میں تھا جس کے
باقیات میں سے آج محض ایک مسجد باقی ہے۔ اس طرح ایک اور محل قریب
ہی تھا جسے سوہن محل کہتے تھے ان کے کھنڈرات ہم نے بھی دیکھے
ہیں۔ اور یہ تمام عمارات عہد مغل کی تعمیر شدہ تھیں جو طرز تعمیر سے بھی واضح ہے۔
وزیر خاں کی مسجد کے جلوخانہ کے شمال مشرقی اور جنوب مشرقی کونوں میں
آج بھی قدیم حویلیاں ہیں جو لازماً عہدِ مغلیہ کی تعمیرات ہیں جیسا کہ لالہ کنہیا لال
نے لکھا ہے (صفحہ ۳۵۳ و ۳۵۳) مگر یہ ہر دو حویلیاں لاجپت رائے نانک چند - اور دیوان
اجودھیا پرشاد کی بعد میں شمار ہوتی رہی ہیں۔ کیونکہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ

کے زمانہ میں اس کا قبضہ ہو گیا اور دیوان گنگا رام لاہور میں آیا اور مہاراجہ نے
دیوانی مال کی اس کے سپرد کی تو حویلی اس کے رہنے کیلئے مرحمت ہوئی جس کے
بعد بھی حویلی اس کے لڑکے اجودھیا پرشاد کے قبضہ میں آئی اور آخیر تک
یہی خاندان اس پر قابض رہا مگر ان حویلیوں کا مشاہدہ واضح کرتا ہے کہ یہ تمام
تر شاہجہانی عہد کی عمارات تھیں بلکہ تاریخ بیان کرتی ہے کہ اس حویلی کو میر جواد
نے نواب زکریا خاں کی صوبیداری کے زمانہ میں تعمیر کیا تھا۔ اور آج بھی دیکھی
جاسکتی ہیں۔ حویلی راجہ دھیان سنگھ ہیرا منڈی میں منسپل ہسپتال کے سامنے
مغرب کی طرف ہے کبھی اس میں دیال سنگھ ہائی سکول بھی تھا اور آج بھی
مسلم لیگ ہائی سکول ہے حویلی جمعدار کے برابر وسیع ہے خوشحال سنگھ۔ جو چونہ منڈی میں
ہے جس میں سی آئی اے پولیس کا محکمہ آج ہے اسی میں دھیان سنگھ کی سمادھ
بھی ہے مگر اس عمارت کا تمام نقشہ اور دیگر شواہد ثابت کرتے ہیں کہ یہ سکھوں کے
عہد سے قبل کی عمارت ہے۔ اسی حویلی کے مغرب کی طرف جو حصہ آج تحصیل کے
نام سے مشہور ہے تین قدیم حویلیوں پر مشتمل ہے اور یہ تمام راجہ سوچیت سنگھ
کی حویلیاں ہیں بلکہ چوتھی عمارت ایک اصطبل ہے۔ حویلی کابلی مل جسے ہم ادھر
سے ڈبی بازار کے راستہ سے اور ادھر سے چونہ منڈی کے راستہ پہنچتے
ہیں مگر قدیم عمارت مٹ چکی ہے البتہ راقم نے اس کے بعض کھنڈرات ضرور
دیکھتے ہیں یہ شخص کابلی مل تین حاکموں کے زمانہ میں یہاں حاکم تھا۔ حویلی،
اہلو والیہ کی دروازہ میں تھی جو ہمارے زمانہ میں گرادی گئی اس کی بنیادیں
زمین میں قریب تیس تیس فٹ تک تھیں راقم نے اسے دیکھا ہے کیونکہ اس میں

کافی سرد خانے تھے کہنا پڑتا ہے کہ یہ عمارت واقعی بہت ہی قدیم تھی اور بقول کنہیا لال اس کا بانی نواب زکریا خاں بہادر تھا آج یہاں لکڑی کے ٹال اور گوجروں کے مکانات ہیں۔ اسی سے ذرا آگے ایک حویلی ملا محمد غوث کی آج بھی موجود ہے نہ معلوم اس کے بانی کون تھے مگر ملا محمد غوث نے اسے خود خریدا تھا آج ان کی اولاد اس میں کئی خاندانوں میں آباد ہے۔ راقم کے ان سے مراسم ہیں اس کے سرد خانہ میں ایک حصہ الگ بطور مسجد کے بھی قبلہ رخ ہے اس طرح لاہور میں اندھی حویلی کافی مشہور تھی جو جوڑے موری میں واقع ہے اور اس کی بہت بڑی ڈیوڑھی تھی اور بہت وسیع تھی مگر سوتر منڈی یا کوچہ حمام والا میں حویلی نواب امام الدین بھی کافی مشہور تھی جو آج بھی موجود ہے اس میں حکیم فقیر محمد مرحوم نے کافی عرصہ سکونت رکھی مگر ان میں حویلیوں میں دیوان لکھپت رائے اور جسپت رائے کی حویلیاں بھی قابل ذکر ہیں جو محمد شاہ کے زمانہ کی بیان کی جاتی ہیں۔ جو دراصل نواب سرفراز خاں کی حویلی تھی جسے رنجیت سنگھ نے ان کو دیدیا تھا اور یہ مکان بعد میں نوابان ملتان کے قبضہ میں رہا اور شاہ عالمی دروازہ کے اندر تھا اس میں ہمارے مرحوم دوست نواب مظفر گوہر کا خاندان مقیم تھا۔ غرضیکہ لاہور میں یہ تمام حویلیاں دراصل ہماری تہذیب و ثقافت کا آئینہ تھیں۔ اور اگر مزید تلاش کی جائے تو اکثر ایسے مقام لاہور میں ملینگے جہاں کبھی محلے اور حویلیاں آباد تھیں مگر آج بالکل نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ اور آج بھی داتا گنج بخش ہجویری کے مزار سے مغرب کی طرف چلے جائیں تو اس علاقہ کو شیش محل کہتے ہیں۔ اور

اسی طرح اورنٹیل کالج کے پاس جو گورنمنٹ کالج کے پروفیسروں کے مکانات میں اسے بھی شیش محل کہتے تھے مگر سکھوں کے زمانہ سے نقشہ ہی بدل گیا۔

لاہور کے باغات

میرا عقیدہ ہے کہ محض لاہور ہیں تمام ہندو پاکستان میں ایک ایسا شہر علاوہ کشمیر کے ہے جہاں اسقدر باغات آج بھی ہیں اور ماضی میں تھے کہ کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا بلکہ بعض نے تو اسے شہرِ باغات لکھا ہے پھر اس پر طرّہ یہ کہ ان باغوں کے ان کے دل افروز مناظر کی وجہ سے ایسے ایسے نام تھے جو کسی شہر کو نصیب نہیں ہوتے کہیں باغ دلکشا۔ دلآرام۔ دل آویز شالامار وغیرہ کے علاوہ ان کے بنانے والوں کے نام پر ان باغات کے نام الگ تھے ہم متذکرہ بالا سطور میں شالامار سے متعلق لکھ آئے ہیں مگر اسی طرح اس باغ کے سامنے جنوب کی طرف اور اس کے پیچھے شمال کی طرف عنایت باغ وغیرہ الگ تھے۔ جن پر سکھوں کا قبضہ ہوگیا تھا بقول لالہ کنہیالال علاقہ نو لکھا و بیبے شہر کے متصل تھا جو نواب علی مردان خاں کا شمار ہوتا تھا مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار فتح سنگھ اہلو والیہ کو بخشدیا تھا اس نے کچھ ترمیم کی اور راجہ نہال سنگھ کے وقت تک بارونق رہا یعنے حصہ شہر آج بھی ریلوے سٹیشن کے قریب اسی نام سے مشہور ہے۔ لاہور میں مستی دروازہ کے باہر

جہاں آج لاریوں کا اڈہ ہے ایک قدیم بہت ہی پر فضا باغ تھا اور باغ جمعدار کے نام سے مشہور تھا۔ یعنے جمعدار خوشحال سنگھ سے اسے نسبت تھی مگر یہ باغ قدیم تھا کیونکہ جمعدار خوشحال سنگھ کی بقول لالہ کنہیا لال سمادھ بھی یہیں اسی جگہ ہیں اور راجہ تیجا سنگھ کی بھی اس وجہ سے بھی اس سے منسوب رہا (ص۳۶۰) موضع کھوئی میراں میں بھی باہر کافی باغ تھے اور اس علاقہ سے ہمیشہ تاریخی اہمیت رہی ایک باغ راجہ تیجا سنگھ کے نام سے مشہور تھا اور بعد میں راجہ ہربنس سنگھ اس کے مالک ہوئے۔ بدھ گاہ گھوڑے شاہ کے بالکل قریب مشرق کی طرف ایک باغ راجہ دینا ناتھ کے نام سے آج بھی موجود ہے مگر اس کا نقشہ اور اس کی قدیم روشیں ظاہر کریں گی کہ یہ واقعی زیادہ پرانا باغ تھا۔ باغ لالہ رتن چند ڈاڑھی والہ بے شک عہد سکھی کا یہاں پرانے کھنڈر تھے اور خشت فروشوں نے ہزاروں روپیہ کی اینٹیں یہاں سے نکالکر فروخت کیں مگر رتن چند نے اسے از سر نو تعمیر کیا۔ اور آج بھی یہ عمارت باغ رتن چند اوٹ ڈور مریضوں کے میو ہسپتال میں مدغم ہوگیا ہے۔ لاہور میں مائی لاڈو کی مسجد کے مشرقی دروازہ کے سامنے سے جو سڑک بیڈن روڈ کو جاتی ہے اس کے راستہ میں مشرق کی طرف یعنے میڈیکل کالج کے ہوسٹل کے سامنے سے جو عیسائیوں کی عمارت ہے وہ باغ بھائی مہان سنگھ کہلاتا ہے یہ بھی کوئی قدیم باغ تھا اس کے اندر اسی طرح حوض و فوارے اور روشیں تھیں اور پُر رونق مقام تھا مگر بھائی سوایا سنگھ نے یہ باغ پادریوں کے پاس فروخت کر دیا اور آج تک ان کے پاس ہے لاہور کی پبلک پنجاب

لائبریری جہاں آج ہے اور اس کا اصل پرانا حصہ دراصل نواب وزیر خاں بانی مسجد وزیر خاں کا باغ تھا بلکہ اس حصہ لائبریری کا مطالعہ بتائیگا کہ کس طرح اس زمانہ میں باغات میں ایسی عمارتیں بنتی تھیں بلکہ عمارات دو منزلہ ہے بعہد سکھاں یہ بارہ دری داخل چھاونی تھی اور سکھ اس میں قیام پذیر تھے جب عملداری انگریزی کی ہوئی تو اس جگہ محکمہ بندوبست رہا اس کے بعد محکمہ تار اور سامان عجائب گھر بعد میں اسے لائبریری کے لیئے مقرر کیا گیا۔
گمران کے علاوہ لاہور میں اور بھی بے شمار باغات تھے جس پر سکھوں نے قبضہ کیا اور ان کو اپنے طور پر استعمال کیا۔

لاہور کی سرائیں

سرائے گولیاں والی چونکہ اس سرائے میں مہاراجہ رنجیت نے میگھ زین ڈالدیا تھا اور اس کی کوٹھڑیوں میں گولے بھرائے تھے جو دس سال تک اس میں پڑے رہے اس لئے اس وجہ سے اسے گولیاں والی سرائے کے نام سے مشہور کیا گیا ورنہ یہ عالیشان پختہ عمارت سرائے جو موضع اچھرہ کی حدود میں متصل جیل خانہ لاہور موجود تھی یہ ۱۰۲۹ھ میں بحکم جہانگیر بادشاہ تعمیر ہوئی تھی جیسا کہ کنہیا لال نے لکھا ہے (صـ ۳۷۲) بعد میں جمعدار خوشحال سنگھ کے خاندان میں منتقل ہو گئی عمارت پختہ نہایت مستحکم دو دروازے عالیشان تھے۔ جس کے اندر حجرے قالبوتی بنائے گئے تھے اور چھتیں تمام گنبد دار

گر سکھی عہد میں اس کی اینٹیں نکالکر فروخت کر دی گئیں کنہیالال نے اس کی
چشم دید تفصیل دی ہے مگر آج انکا جائے وقوع تعین کرنا مشکل ہے اسی
طرح ہم ایک اور سرائے محمد سلطان کا ذکر کرتے ہیں جو اگرچہ ابتداء عہد انگریزی
کی تعمیر ہے مگر اس کے ساتھ لاہور کی قدیم تاریخ اس طرح وابستہ ہے کہ جس
قدر بھی اس پر اینٹیں یا مصالحہ کام آیا وہ سب کا سب قدیم عہد مغل کی
عمارات سے نکالا ہوا تھا۔ یہ شخص صابن کا کام کرتا تھا اور خود کشتی بھی لانی
کا بھی شوق کرتا تھا اللہ نے اسے بہت امیر کردیا تھا اسے انگریزوں نے چھاؤنی
اور تمام کوٹھیوں کی تعمیر کے لئے ٹھیکیدار مقرر کیا کنہیالال لکھتا ہے (صفحہ ۲۶۵) محمد
سلطان خطاب پایا اس کی دولتمندی سے لوگوں نے فیض بہت پایا عمارات
بھی اس نے بہت سی تعمیر کیں بہت سی کوٹھیاں اور سرائے اور دو چار مسجدیں
بھی تعمیر کیں مگر پرانی مسجدیں اور عمارتیں عہد شاہان سلف کی یادگاریں اس نے
بہت گرائیں اور یہ کام اس نے صرف اینٹ کی طمع سے کیا تاکہ یہ سرائے اور دیگر
اپنی تمام عمارتیں تعمیر کرے کیونکہ اس زمانہ میں کسی اینٹ بنانے والی بھٹی
یا بھٹہ کا ذکر تو ملتا نہیں اور اسی طرح قدیم عمارات کو گرا کر دوسری عمارتیں بنائی
جاتی تھیں اس وجہ سے لاہور کے ایسے بھی بہت سے عالیشان آثار جو اگرچہ
ویسے بصورت کھنڈر یا ویران تھے ان خشت فروشوں نے گرا دئے یہ سب
بیان بہت ہی المناک اور قابل عبرت ہے جس طرح لالہ کنہیالال نے انکی اپنی
تاریخ میں تفصیل دی ہے رونگٹے کھڑے ہونے ہیں اور یہاں ان کا اعادہ
کوئی سودمند بھی نہیں ہے مگر مجھے ٹھیکیدار محمد سلطان کے عمل کو اچھا کہنے کی

ضرورت نہیں مگر بقول لالہ کنہیا لال جب اس نے بعض پرانی عمارتوں کو اینٹوں کی خاطر تباہ کیا تو یہ عین تصور ضرور آتا ہے کہ وہ عمارتیں جو اس کے ہاتھوں تباہ ہوئیں وہ بذات خود اس حالت میں رہ گئی تھیں کہ ان کا برقرار رہنا نہ رہنے کے برابر تھا اس لئے اس نے ان کو گرا کر ان کے مصالحہ سے دوسری ایسی رفاہِ عام کے لئے تعمیر کر دیں ویسے الاعمال بالنیات یعنے اعمال انسانی نیتوں پر ہوتے ہیں۔

لاہور کا ریلوے سٹیشن

آج لاہور کا ریلوے سٹیشن اور اس کے علاوہ ریلوے کی دوسری عملات و دفاتر وغیرہ لاہور کے رقبہ کو احاطہ کئے ہوئے ہیں اگر ان کا صحیح رقبہ نکالا جائے تو میلوں پر پھیلیگا یہ قلعہ لائق عمارت دراصل ٹھیکیدار محمد سلطان نے بنوائی تھی۔ اور آج لاکھوں انسان ریلوے کی ملازمت کی وجہ سے روزی حاصل کرتے ہیں اس کی بنیاد ۱۸۵۹ء میں رکھی گئی تھی کئی پرانی عمارتیں جو عہد مغلیہ کی بہترین یادگاریں تھیں اس کی زد میں آکر تباہ ہوگئیں اور آج بھی کافی عمارتیں ریلوے محکمہ کے احاطہ میں ہیں اور وہاں تک رسائی بھی مشکل ہے۔ مثلاً علی مردان خان کے مقبرہ کا دروازہ آج تک ریلوے سٹور میں ہے۔ ریلوے ورکشاپ میں ایک دفعہ ہے جس پر کاشی کاری کا کام ہے۔ لاہور کے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ریلوے رقبہ میں ایک جہاں گیر کے عہد کی عبادت گاہ تھی جس کی نہایت مکمل تفصیل جستی

نور احمد نے تحقیقات چشتی (ص۹۳۶) میں دی ہے اور اس وقت کوئی ریلوے آفیسر اس میں رہتا تھا یہ عیدگاہ جہانگیر نے بیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار کی تھی اس کے شمال وجنوب کی طرف بازار تھے اور ان میں دکانیں تھیں مگر اسے بعد میں ریلوے حکام نے گرا دیا اور اس کا جائے وقوع ریلوے سٹور کے پاس تھا۔ کیونکہ ریلوے لائن کے لئے راستہ سیدھا درکار تھا جس وجہ سے اکثر قدیم عمارتیں شہید کر دی گئیں۔

گورنمنٹ ہاؤس

اس موقع پر جہاں یہ کوٹھی (جناب گورنر ویسٹ پاکستان) واقع ہے شاہجہانی عہد میں مقبرہ سید بدرالدین گیلانی کا تعمیر ہوا تھا یہ شخص ایک بزرگ خدا پرست عابد زاہد تھا اور اس موقع سے بجانب مغرب اس نے ایک محلہ آباد کیا ہوا تھا اور ایک عالیشان مسجد تعمیر کی ہوئی تھی جس ویرانی و بربادی کا حال پہلے حصہ کتاب تاریخ لاہور از کنہیا لال میں تحریر ہو چکا ہے۔ یہ بزرگ ۱۰۶۷ھ میں فوت ہو کر اس جگہ دفنایا گیا اور اس کی قبر پر اس کی اولاد نے ایک عالیشان گنبد بنایا جب بیرونی شہر لاہور کی آبادیاں سکھوں نے لوٹ کر برباد کر دیں تو یہ جگہ بھی ویران ہو گئی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت شہر کے پہلوانوں نے اس گنبد کے متصل کشتی لڑنے کا اکھاڑہ بنایا اور یہ گنبد کشتی والا گنبد مشہور ہو گیا آخیر عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ

میں جب جمعدار خوشحال سنگھ کے ماتحت فوج کی چھاؤنی اس کے پاس کے
میدان میں مقرر ہوئی تو جمعدار نے اس گنبد کی قبر کو گروا دیا اور اس کے گرد ہشت
پہلو خاص مقبرہ کی قطع کوٹھی بنوالی کبھی تو خود اس میں قیام رکھتا اور
کبھی افسران فوج سکونت رکھتے مختصر باغیچہ بھی جمعدار کے حکم سے یہاں
لگایا گیا یہ مقبرہ خشتی عمارت تھی پتھر اس پر لگایا نہیں گیا تھا ورنہ
مہاراجہ اس کو پتھر کی طمع سے ضرور گرا دیتا خشتی عمارت بھی گرنے والی
نہ تھی ورنہ کشمیریاں خشت فروش گرا دیتے۔

آخر جب سکھی سلطنت پنجاب سے جاتی رہی اور ملک پنجاب زیر سایہ
ابد پایہ سرکار انگریزی آگیا تو پہلے پہل مسٹر لورنگ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر اس
کوٹھی میں قیام پذیر ہوئے پھر میجر میکریگر صاحب ڈپٹی کمشنر بعد منٹگمر
صاحب بہادر نے یہ تجویز کی کہ یہ کوٹھی سرکار میں لے لی جائے اور راجہ
تیج سنگھ قابض جائداد جمعدار خوشحال سنگھ متوفی کو یا تو اس کی
قیمت دی جائے یا مکان کے عوض کوئی سرکاری مکان مبادلہ کر لیا جائے
چونکہ اس عہد میں راجہ تیج سنگھ کی جاگیر میں سیالکوٹ کا علاقہ تھا اور
سکھوں کے آخری عہد میں ضبط ہوئی تھی بعوض اس کوٹھی کے سرکار سے
طلب کی چنانچہ دی گئی اور یہ کوٹھی سرکاری ملکیت اور جائے قیام لفٹنٹ
گورنر بہادر گورنمنٹ ہاؤس قرار پائی اس روز سے اس کی تعمیر کی امداد میں
کوشش ہوتی رہی ہزاروں روپیہ ہر سال خرچ ہوتے رہے جمعدار خوشحال
سنگھ کے عہد کی عمارت کا اب نام ونشان باقی نہیں رہا موجودہ عمارت

سب سرکاری ہے البتہ پرانا مقبرہ کوٹھی کی منزل زیر زمین میں بدستور ہے یہ عالیشان عمارت بے مثل کوٹھی ہشتی قطع پر ہے جس طرح پر کہ پرانے مقبرے کا بیرونی وسیع چبوترہ بنا تھا اور جس قطع وضع پر جمعدار خوش حال سنگھ کی عمارت تھی آٹھوں پہلوؤں میں سے نصف زمین زیر آمد کوٹھی کی دو منزلہ ہے اور تین پہلوان کی تصاویر یعنی نصف سے کچھ کم ایک منزلہ کیونکہ زمین اس کی مغربی پشت اور مشرقی اونچی ہے نصف دو منزلہ کے نیچے منزل میں مکانات بنے ہیں جن میں اسباب گودام وغیرہ رکھا رہتا ہے۔ اور نیز حصہ اس گنبد کا جس کا دروازہ آمدورفت مسدود ہے بالائی منزل یعنی عین کوٹھی کی عمارت کے وسط میں ساڑھے تیس فٹ لمبا چوڑا اندر سے مربع ہے باہر سے ہشتی شکل پر ہے سیڑھیاں نہایت عمدہ مکلف لکڑی کی بنی ہوئی ہیں عمارت کا بڑا حال غرب کی سمت ہے۔ کھڑکیاں اور بخارچے بھی لکڑی کے ہیں۔ اس کوٹھی کا نہایت عالیشان برآمدہ خوبصورت لوکدار ڈاٹوں کا بنایا گیا ہے باہر نہایت مکلف و عالیشان باغ بہت وسیع ملحق ہے جس میں طرح طرح کے درخت، پھلدار ہیں۔ گھوڑوں کا اصطبل۔ شتر خانہ فیلخانہ غرضیکہ بہت وسیع کوٹھی ہے۔ اس کی سالانہ مرمت ۱۸۸۶ء تک رائے بہادر لالہ کنھیا لال انجنیئر کے اہتمام میں ہوئی۔ (صفحہ ۱۰۶-۱۰۱)

تبصرہ و نتیجہ

یہ تمام متذکرہ بالا بیان نہایت مستند ماٰخذ سے استفادہ کرکے
لکھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ اور بعض آثاروں کے متعلق بالکل سکوت
اختیار کیا گیا اور بعض اشخاص و اثاروں کے حالات کو نہایت،
وضاحت سے کام لیا گیا ہے ورنہ وہ ابھی تک معمہ بنے ہوئے تھے۔
سکھوں نے محض ان آثاروں کو برباد ہی نہیں کیا اور ان کا سامان و مسالہ نہیں
اتارا جیسے انہوں نے اپنے آثاروں پر لاہور و امرتسر وغیرہ مقام پر استعمال کیا
بلکہ ان کے اس عمل سے جرأت کرکے دوسرے لوگوں نے بھی کمی نہیں کی۔ چنانچہ
آج تک بعض نہایت اہم اور مکمل عمارات تک غیر مسلموں کے قبضے میں چلی
آرہی ہیں خیال تو یہ تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد ان امور کی طرف کما حقہ
توجہ ہوگی اور ان آثاروں کو جو ہماری تاریخ و ثقافت کے نشان ہیں۔
اور ہمارے بزرگوں کا ترکہ ہے جن کا تحفظ ہمارا فرض ہے اور ان میں
بعض آثار ایسے ہیں جن کے بہت جلد تباہ اور برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے
مگر ہنوز باوجود بار بار توجہ دلانے کے بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی ۔ البتہ بعض
آثاروں میں خلافِ قاعدہ و روایات محکمہ آثار قدیمہ تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں

اور بعض کو جو مرمت وغیرہ کی گئی ہے وہ بالکل نازیبا ہے مگر مقبرہ نور جہاں۔ بارہ دری مزار کامران دو بین ثبوت وشہادتیں ہیں۔ اگر پاکستان بننے کے بعد ان تمام پاکستانی قدیم آثاروں کی ایک فہرست بھی شائع کرائی جاتی جو ہمیں ترکہ میں ملے تو کم سے کم ہمارے علم میں کچھ تو اضافہ ہوتا اور ان کے تحفظ کی طرف عوام بھی توجہ کرتے یا جو اس فہرست میں شامل نہیں کئے گئے تھے ان کو بھی شامل کیا جاتا افسوس اس امر کا ہے کہ کچھ بھی نہیں کیا گیا یہ محض محکمہ آثار قدیمہ کی عدم فرض شناسی اور غیر دلچسپی کی بین دلیل ہے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ یہ محکمہ محض پبلک سے براہ راست تعلق رکھتا ہے اس وجہ سے گورنمنٹ آف انڈیا سے ہر سال اس محکمہ کی باقاعدہ رپورٹ شائع ہوا کرتی تھی جس سے پبلک ہر کاروائی سے آگاہ رہتی تھی۔ ایک امر اور مزید وضاحت کا محتاج ہے یعنی بعض غیر مسلم مورخین نے انہیں کم علمی اور تعصب کی بنا پر یہ الزام لگایا ہے کہ مسلمانوں نے بھی تو غیر مسلم عبادت گاہوں کو اپنے عہد حکومت میں مساجد میں تبدیل کر لیا جس کا ہمیں بہت عمدگی سے اقرار ہے۔ ابتدائی دور عہد اسلامی میں ایسا ضرور ہوا جبکہ مسلمانوں کو یہاں بطور مجاہد جہاد کرنا پڑا اور غیر مسلموں نے اپنی عبادت گاہوں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں قلعہ بنا لیا تھا اور جہاں بھی ایسا ہوا اسے فراخدلی سے بصورت تحریر وکتبہ وغیرہ اقرار بھی کیا جیسا کہ آج تک مسجد قوۃ الاسلام دہلی پر دہلی کے فاتح قطب الدین ایبک کے زمانہ کا کتبہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ یہ مسجد قدیم دیولول کے سامان سے تعمیر ہوئی بلکہ اس قدیم ہندو عمارت کے بعض حصے ابھی

تک اس مسجد کے حصے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ہاں اگر مسلمان بھی سکھوں کا سا عمل اپنے عہد حکومت میں اختیار کرتے تو ہندوستان ہی میں جہاں انہوں نے کئی صدیاں متواتر حکومت کی ہے تو غیر مسلم عمارات میں سے آج ایک بھی موجود نہ ہوتی اور آج بھی اگر غیر مسلم عبادت گاہوں کا صحیح جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی مساجد سے ان کی تعداد کم نہیں۔ یہ مسلمانوں کی فراخ دلی اور مذہبی رواداری کی دلیل ہے۔ مسلمانوں کے تعمیری و ثقافتی کارنامے آج فنونِ لطیفہ کی تمام تاریخ و تمدن عالم میں ایک مستقل باب کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ محض وہی قوم کر سکتی ہے جو دنیا میں رہنا جانتی ہو اور اس کے مذہب میں دوسرے مذاہب کا بھی کوئی مقام و احترام ہو۔

ہماری

دیگر مطبوعات

مصنفہ و مؤلفہ

عبداللہ چغتائی

کتاب خانہ نورس (کاپی بک شاپ) کبیر سٹریٹ۔ کاپی بازار۔ لاہور

۱۔ تاج محل آگرہ

فن تعمیر اسلامی ہند و پاکستان کا مکمل محققانہ مطالعہ جس میں
سب پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔
مع ۵۷ تصاویر، دو رنگین، خوبصورت مجلد ڈائی دار قیمت ۱۰/۰۰

۲۔ سیرت بلال رضؓ

اس کتاب میں ایک عام مسلمان فرد کی حیات کے لیے حضرت بلالؓ
کے واقعاتِ زندگی کو بطور نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی
ہے جو حبشی النسل تھے مگر اسلام میں انہیں اول مؤذن کا درجہ ملا۔
جس میں عکس قبر بلالؓ اور روضۂ اقدس صلعم ہیں۔
خوبصورت مجلد ڈائی دار

قیمت ۶/۲۵

OUR English Publications!

1- Discription of the TAJ. 0.75
2- Architect of the Taj Mahal Agra 0.75
3- A century of painting in the Punjab 0.75
4- Mosque during the first century of Islam in Indo Pakistan. 0.50
5- Exebition of Islamic Art. 1.00
6- Painting during the Sultnate Period 15.00
7- The oldest Extent Muslim Architectural Relic of Lahore. 0.75
(with 8 illustrations)

FORTH COMING

Lahore through the Ages.

۱۷- اسلام میں مسجد کا فنِ تعمیر یعنی
مسجدِ نبویؐ مع چند تصاویر — ۰٫۵۰

۱۸- لاہور سکھوں کے عہد میں
مع نقشہ لاہور قلعہ و مسجد شہید گنج — ۲٫۰۰

۱۹- فنِ تعمیر
اردو میں تمام دنیا کے فنِ تعمیر پر پہلی تصویر دار کتاب
جو اس فن پر یونیسکو کے پروگرام کے تحت لکھی گئی۔
اس میں ۹ تصاویر ہیں اور عمدہ ٹائپ میں
بڑے سائز کی طباعت — ۱٫۷۵

ہماری زیرِ طبع مطبوعات

۱- دنیا کے نقش و نگار ۲- اسلامی مصوری

۳- ہمارا جمالیاتی سرمایہ
خشت و سنگ خطاطی و مصوری

۴- بادشاہی مسجد - لاہور

۳- لاہور کی کہانی آثار کی زبانی (اعلیٰ طباعت ٹائپ)	۰/۵۰
۴- مغربی آرٹ کی مختصر تاریخ (" ")	۲/۰۰
۵- فنونِ لطیفہ بعہد اورنگ زیب عالمگیر	۲/۰۰
۶- علم پروری و ہنر شناسی	۱/۵۰
۷- حالاتِ ہنروراں (فارسی) تذکرہ خطاطان و نقاشان	۱/۵۰
۸- ریحان نستعلیق (فارسی) فن خطاطی و خطاطان	۱/۰۰
۹- جہانگیر کا ذوقِ مصوری	۱/۵
۱۰- اسلامی کوزہ گری	۰/۷۵
۱۱- تاریخ مظفر شاہی (فارسی) ۹۲۴ھ میں گجرات و مالوہ	۳/۰۰
۱۲- احمد معمار لاہوری لاہور کے ایک فن کاروں کا خاندان	۰/۷۵
۱۳- علامہ اقبال اور سید سلیمان ندوی کے خطوط	۰/۵۰
۱۴- طبقاتِ ناصری (متعلقہ ہند و پاکستان)	۳/۷۵
۱۵- قصہ نل دمن فیضی کا ایک نادر نسخہ	۰/۵۰
۱۶- علامہ سید سلیمان ندوی کے خطوط بنام ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی	۰/۵۰

کِتاب خانۂ نورَس

کاپی بک شاپ ،

کاپی بازار کبیر سٹریٹ ۱۰ انارکلی لاہور ۲